نظام تعلیم

مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی



سید احمد شہید اکیڈمی
دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

نظام تعلیم

مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مرتب

عبد الہادی اعظمی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ - اگست ۲۰۱۲ء

کتاب	:	نظام تعلیم - مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت
مصنف	:	حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
ترتیب	:	عبدالہادی اعظمی ندوی
صفحات	:	۱۰۴
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)
سیٹنگ	:	سید محمد مکی حسنی ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی

☆ مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سیّد احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہرست

نظام تعلیم وتربیت کا معاشرہ اور اس کے رجحانات سے گہرا تعلق ہے

نظام تعلیم وتربیت کی بنیادیں

نظام تعلیم میں نظر ثانی کی ضرورت

نصاب تعلیم قوم کے فکری ارتقا اور ذہنی صلاحیت کا آئینہ دار ہوتا ہے

ہندوستان میں مسلم بچوں کا تعلیمی مسئلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

تعلیم کا مسئلہ ہر ملک کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے، کسی بھی ملک یا قوم کی ترقی کے لیے یہ ایسی شاہ کلید ہے کہ جس سے پھر سارے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں، مسلمانوں نے جب تک اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا وہ دنیا کے منظر نامہ پر چھائے رہے اور انھوں نے دنیا کو علم کی روشنی سے بھر دیا، انھوں نے تعلیم کے لیے کچھ بھی دوئی نہیں برتی، اور اس کو انسانیت کی فلاح و بہبودی کا ذریعہ بنایا، لیکن جب مسلمانوں کی غفلت کے نتیجہ میں پوری دنیا اخلاقی بحران کا شکار ہوگئی تو عالم اسلام خاص طور پر اس سے متاثر ہوا، اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے اپنی بنیاد ہی فراموش کر دی، اور عرصہ کے بعد جب دوبارہ بیداری پیدا ہوئی تو اس نے وہی نظام تعلیم اختیار کر لیا جو یورپ کا تیار کردہ تھا، اس کی بڑی وجہ برطانیہ وفرانس کا سامراجی نظام ہے، جو دنیا کے اکثر حصہ پر قائم رہا، اور جب سیاسی مجبوریوں کی بنا پر ملکوں کو آزاد کیا گیا تو جسم تو آزاد ہو گیا، لیکن عرصہ تک غلامی میں رہنے کی وجہ سے ذہن و دماغ غلامی کے شکنجے میں جکڑے رہے، اور ان ملکوں میں یورپ نے جو نظام تعلیم جاری کیا تھا وہی نظام سامراجی دور کے بعد بھی قائم رہا، اس چیز نے پورے عالم اسلام کو متاثر کیا، خود اسلامی ملکوں میں پڑھنے والوں کا حال یہ ہوا کہ وہ اپنی اپنی یونیورسٹیوں سے پڑھ کر نکلے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ یورپ کے پروردہ ہیں، ان کے ذہن و دماغ وہیں کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے اور خود وہیں کی تہذیب میں رنگے ہوئے۔

ان مشرقی ملکوں کا مزاج اور وہاں کی روایات کا یورپ کے اپنے اصولوں اور روایات سے کوئی جوڑ نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ملکوں میں ایک کشمکش کی فضا پیدا ہوگئی، اسلامی ملکوں

میں قدرتی طور پر یہ کشمکش زیادہ وسیع پیمانہ پر اور شدت کے ساتھ پیدا ہوئی اور ان ملکوں کی صلاحیتیں ان ہی آپس کے نزاعات میں ضائع ہونے لگیں، جو خانہ جنگی تک پہنچ گئے تھے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان اسلامی ملکوں میں ذہنی کشمکش کا بنیادی سبب اسی نظام تعلیم کو قرار دیا ہے، اور از سر نو پورا نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے، اور اس کو عالم اسلام کا سب سے بڑا چیلنج قرار دیا ہے، کسی بھی ملک میں اصلاح و انقلاب کا سب سے بڑا ذریعہ حضرت مولانا تعلیم ہی کو قرار دیتے ہیں، اور اس کے لیے نظام تعلیم کو ملک کے مزاج و مذاق سے ہم آشنا بنانا مولانا کے نزدیک سب سے ضروری ہے، اور اس میں سب سے بڑی ذمہ داری اسلامی ملکوں کی ہے جن کے پاس وہ بلند آسمانی تعلیمات ہیں جو علم کی نہ صرف آبیاری کرتی ہیں، بلکہ اس کی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہیں۔

حضرت مولانا کی تقریروں، اور تحریروں کا یہ اہم موضوع رہا ہے، بڑی خوشی کا موقع ہے کہ عزیز القدر مولوی عبدالهادی اعظمی ندوی سلمہٗ نے متفرق تقریروں اور مضامین کو جمع کر کے ان کو کتابی شکل دی، علم کے موضوع پر اکیڈمی سے شائع ہونے والی حضرت مولانا کی یہ تیسری کتاب ہے، امید ہے کہ ان شاءاللہ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس میں سب حصہ لینے والوں کو اجر عطا فرمائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی
مركز الإمام أبي الحسن الندوي
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ

اسلامی ممالک میں ذہنی کشمکش

اور

اس کے اسباب

الحمد للّٰہ وحدہٗ و الصلاۃ و السلام علی من لا نبی بعدہٗ.

وائس چانسلر، اساتذۂ کرام، برادران عزیز!

مراحق ہے فصل بہار پر

اس جامعہ کی نسبت جس گرامی شخصیت سے قائم ہے، اس کی دعوت پر مجھے یہاں آنے سے جو مسرت ہوئی، وہ کم دانش گاہوں میں جانے سے ہوئی ہوگی، میں اپنی اس تقریر کا آغاز فارسی کے اس مشہور مصرع سے کرنا چاہتا تھا کہ

ع غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

لیکن چونکہ اس جامعہ اور اس دانش گاہ کی نسبت اقبال سے ہے، اس لیے اب میں اس کے بجائے جگر کا مصرع پڑھوں گا:

ع میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مراحق ہے فصل بہار پر

یہ اگر اقبال کا چمن ہے تو میں بھی اس کا بلبل ہوں، اور مجھے اس چمن کے کسی بھی شاخسار پر بیٹھنے کا حق ہے، اس لیے میں غریب شہر نہیں ہوں، مجھے اس شہر کا ایک باشندہ یا اس چمن کا ایک بلبل سمجھیے۔

اقبال کے تعلیمی افکار

حضرات! وقت بہت کم ہے، اور اقبال نے تعلیم پر جو کچھ لکھا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے، اور میں یہ گزارش کروں گا اس جامعہ کے ذمہ داروں سے کہ اسے ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے یہاں نصاب میں داخل کریں، تعلیم کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر اور اقبال کی تنقید اور ان کے خیالات پر اگرچہ مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کو علاحدہ کر کے اور مستقل فن اور مستقل موضوع بنا کر اس جامعہ میں تحقیقی کام ہونا چاہیے، اقبال ان چند خوش قسمتوں میں سے تھے، جو خود اپنے الفاظ میں جدید نظام تعلیم کے آتشکدہ یا نارنمرود میں بیٹھ کر بہت کچھ ابراہیمی خصوصیات کے ساتھ نکلے۔

انھوں نے اس پر بھی فخر کیا ہے کہ میں اس جال میں پھنسا تھا، لیکن اس کا دانہ لے کر نکل گیا، میرے بال و پر اس جال میں پھنسے نہیں رہے:

طلسم علم حاضر را شکستم ربودم دانہ و دامش گسستم
خداداند کہ مانند براہیم بنار او چہ بے پروا نشستم

برصغیر ہندو پاک کا امتیاز

مشرقی ممالک کے نوجوان مغرب اور خاص طور پر انگلستان، جس کو ہندوستانی ولایت کے نام سے یاد کیا کرتے تھے، تعلیم کے لیے جایا کرتے تھے، (اقبال کے لیے معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں) جو بڑے اقبال مند ہوتے تھے، ان کو وہاں کا سفر نصیب ہوتا تھا، وہ اس پر پھولے نہیں سماتے تھے، میرے شعور کی آنکھیں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر کھلی ہیں، میں نے تحریک خلافت کو بہت قریب سے دیکھا ہے، میں اس کا ایک طرح سے معاصر و ہم عمر ہوں، اس زمانے میں انگریز کا طوطی بولتا تھا، کسی کھاتے پیتے گھر کے لیے سب سے بڑے فخر کی بات یہ تھی کہ فلاں زمیندار صاحب، فلاں سید صاحب، فلاں شیخ صاحب، فلاں خان صاحب کے صاحبزادے ولایت گئے ہیں، اس وقت مصر و شام سے کم، ہندوستان سے زیادہ

مغربی ممالک کی طرف نوجوانوں کا رخ تھا، غیر منقسم ہندوستان سے اس وقت بہترین جوہر، اور بہترین صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان انگلستان گئے اور وہاں خاص طور پر آکسفورڈ اور کیمبرج میں انھوں نے تعلیم پائی، ہم برصغیر کے مسلمان اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ وہاں کے اسلام سوز اور اخلاق سوز ماحول کے اثرات سے جو لوگ آزاد ہو کر نکلے بلکہ ایک طرح سے باغی ہو کر نکلے، ان میں ہم دو شخصیتوں کے نام لے سکتے ہیں، ایک علامہ اقبالؔ اور ایک مولانا محمد علی جوہرؔ، مصر بلکہ مشرق وسطی کو بھی اپنی طویل تاریخ میں یہ فخر حاصل نہیں، وہ کسی ایسے مغربی نوجوان تعلیم یافتہ کا نام نہیں لے سکتا جس نے اقبال کی طرح اپنی خودی کو قائم رکھا ہو، بلکہ وہ خودی کا مبلغ بن کر آیا ہو، اور مولانا محمد علی جوہرؔ جیسا جوہر قابل جو اس تہذیب کا باغی، اس ملک کا باغی اور ایک شعلۂ جوالہ بن کر آیا، یہ ہمارے اس تحتی براعظم کے لیے فخر کی بات ہے، کم سے کم یہ دو نام ہیں جن کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا، ورنہ میں اور بھی بہت سے نام پیش کرتا جو وہاں سے کچھ لے کر آئے، کچھ کھو کر نہیں آئے، حقیقت کا علم تو صرف اللہ کو ہے، لیکن ہم اقبال کا کلام پڑھتے ہیں، مولانا محمد علی جوہر کی تحریریں پڑھتے ہیں، کامریڈ میں اور ہمدرد میں، تحریک خلافت میں انھوں نے جو قائدانہ کردار ادا کیا، اس کو دیکھتے ہیں، ان کی تقریریں پڑھتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کا فکری طور پر اقبالؔ سے بڑھ کر باغی، اور مغربی سیاست اور تمدن کا محمد علی سے بڑھ کر باغی مشرق کے اسلامی ممالک میں نہیں ملتا، اقبالؔ نے اس پر بجا فخر کیا ہے، انھوں نے کہا ہے:

نشستم با نکویان فرنگی　　　　ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

میں خوبانِ فرنگ کے ساتھ بیٹھا (ان کی مراد جمال علمی و جمال تہذیبی سے ہے) اپنی عمر میں کوئی ایسا بے نور دن یاد نہیں جو ویسا گزرا ہو، کبھی انھوں نے کہا:

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

انھوں نے اپنی خودی کو برقرار رکھا، بلکہ وہ خودی کے مبلغ بن کر آئے، انھوں نے مغربی

علوم کے قلب وجگر میں اتر کر مغرب کی کمزوری کو دیکھا، اور اس سے فائدہ اٹھایا، آپ کی اس جامعہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کا انتساب اقبال سے ہے۔

ممالک اسلامیہ میں کشمکش کا بنیادی سبب

وقت کم ہے، آپ کے سامنے ایک مسئلہ رکھنا چاہتا ہوں، جس پر ہماری تمام جامعات کے دانشوروں کو اور ہمارے تعلیمی پالیسی بنانے والوں کو غور کرنا چاہیے، ابھی دو تین سال کا واقعہ ہے کہ میں بیروت گیا، میرے ایک بڑے ذہین وصاحب علم دوست مجھے اپنی گاڑی پر بیروت کی سیر کرا رہے تھے، انھوں نے گاڑی چلاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ مولانا! آپ سے میں ایک سوال کرتا ہوں کہ ممالک اسلامیہ میں جو ذہنی، فکری وسیاسی بے چینی اور کشمکش پائی جاتی ہے، یہ غیر اسلامی ممالک میں کیوں نہیں پائی جاتی؟ یہ ہندوستان، جاپان وسیلون میں کیوں نہیں پائی جاتی؟ یہ اسلامی ممالک کے ساتھ کیوں مخصوص ہے؟ یہاں ایک صف آرائی اور قیادتوں اور عوام میں دو متقابل محاذ بنے ہوئے ہیں، اس کے نتیجہ میں انقلابات کثرت سے آتے ہیں، حکومتیں تبدیل ہوتی ہیں، عوام کو اپنے قائدوں اور حکمرانوں پر بھروسا نہیں، اور برسر اقتدار طبقہ کو عوام کی طرف سے اطمینان نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ میں ان کے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا، ان کو باتوں میں مشغول رکھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ خود میرے ذہن کے اندر ایک سوال پیدا ہو گیا کہ شاید اس سے پہلے یہ سوال میرے ذہن میں نہیں تھا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اور اس بے چینی کے کیا اسباب ہیں؟ روز ہم سنتے ہیں کہ ان ملکوں میں مستقل ٹکراؤ ہے، وہاں تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے، مستقل فلسفۂ اخلاق کا ٹکراؤ ہے، بعد میں میرے ذہن میں اس کا ایک جواب آیا، وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، جس کی وجہ سے مجھ پر اور آپ پر اور ان جامعات کے ذمہ داروں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

بات یہ ہے کہ جو فلسفۂ تعلیم ان غیر اسلامی ممالک میں آیا، وہاں کے اقدار اور بنیادی عقائد سے متصادم نہیں تھا، ان اقدار میں اول تو جان نہیں تھی، جان تھی بھی تو ان میں ہر نئے فلسفے کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی، ان کی تو بنیاد ہی مستحکم نہیں، بہت سیال ورقیق قسم کی چیزیں ہیں،

مثلاً میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ جب جواہرلال صاحب سے پوچھا گیا کہ ہندو کی کیا تعریف ہے؟ تو انھوں نے بہت سوچنے کے بعد کہا کہ جو اپنے کو ہندو کہے وہ ہندو ہے، ہمارے ایک دوست نے واقعہ سنایا، وہ محکمۂ تعلیم کے آدمی تھے، کہ ہم لوگ اسٹاف روم میں بیٹھے ہوئے تھے، میں نے اپنے ایک ہندو پروفیسر دوست سے کہا: پروفیسر صاحب! ہم سے اگر پوچھا جائے کہ دو لفظوں میں اسلام کا خلاصہ بیان کردو تو ہم کہیں گے: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ پر ایمان رکھنا ہے، اگر آپ سے پوچھا جائے کہ دو لفظوں میں آپ ہندوئیت کی تعریف کر دیجیے تو آپ کیا کہیں گے؟ اور دیکھیے کسی گہرے فلسفے کی ضرورت نہیں ہے، میری لائبریری میں بہت سی کتابیں ہیں، میں پڑھ لوں گا، آپ تو اس وقت دو لفظوں میں بتا دیجیے کہ اگر مجھ سے ہی کوئی پوچھے کہ ہندو کسے کہتے ہیں اور اس کی کیا تعریف ہے، تو میں کیا جواب دوں؟ تھوڑی دیر سوچتے رہے، کہنے لگے: مسٹر قدوائی! اصل بات یہ ہے کہ جو کسی چیز میں Believe نہیں کرتا، وہ بھی ہندو ہے، اور جو ہر چیز میں Believe کرتا ہے وہ بھی ہندو ہے، تو ان کا نظام عقائد اگر ہے تو وہ اتنا روادار ہے کہ ہر فلسفہ کا ساتھ دے سکتا ہے، اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں، اس لیے فرض کیجیے کہ مغرب کا نظام تعلیم جب ہندوستان میں آیا تو اس نے ہندو سوسائٹی میں کوئی بے چینی پیدا نہیں کی، کچھ پرانے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ سمندر کا سفر نہیں کر سکتے، صبح کا نہانا ضروری ہے، اس کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتے، اس کے اندر کیا جان ہے؟ تھوڑے دنوں کے اندر معلوم ہو گیا کہ ہم نے بے سوچے سمجھے باتیں قبول کر لی تھیں، یہ موجودہ تمدن کے ساتھ نہیں چل سکتیں، لیکن اصل مسئلہ پیش آیا ہمارے مسلم معاشرہ کو، وہاں توحید کا ایک مفہوم ہے، اس کے متعین حدود ہیں، کہ یہاں تک ایمان ہے، اس کے بعد کفر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، ایک وقت میں آدمی کئی مذاہب کا وفادار نہیں ہو سکتا، بیک وقت آدمی توحید و شرک کو جمع نہیں کر سکتا، اور یہ خیال کہ مغرب سب کچھ ہے، اور وہی قیادت کا اہل ہے، پھر اس کے بعد رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دائمی و عالمی رہنما اور معیار ماننا اقبال ہی کے الفاظ میں کہ

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے　　غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

نور ایک ہے اور ظلمتیں بے شمار ہیں

وہ رسول اللہ (ﷺ) کو دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل بھی سمجھے، اور مغربی تہذیب کو حرف آخر بھی سمجھے، سائنس کو علم کی معراج بھی سمجھے، دونوں باتیں جمع نہیں ہوسکتیں، اس لیے بے چینی ان ملکوں میں نہیں ہوسکتی جہاں مذہب کا کوئی مثبت معین نظام نہیں تھا، جس کو کسی بات پر اصرار نہیں کہ یہ ہدایت ہے، یہ ضلالت، ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّى تُصْرَفُونَ﴾ [سورة یونس:۳۲] ہدایت کے بعد ضلالت کے علاوہ باقی کیا رہتا ہے؟ وہ کہتا ہے: نور ایک ہے، ظلمات بے شمار ہیں، آپ قرآن مجید میں دیکھیے، کہیں نور کی جمع استعمال نہیں ہے، کیا عربی میں نور کی جمع آتی نہیں؟ کوئی طالب علم کہہ دے: "أنوار" آتی ہے، آپ کے یہاں کتنے بھائیوں کے نام انوار ہوں گے، ممکن ہے دو چار انوار یہاں بھی مل جائیں، تو نور کی جمع نہ صرف یہ کہ موجود ہے، بلکہ غیر فصیح بھی نہیں ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں نور ایک ہی ہے، اور ظلمات کا کوئی حساب وشمار نہیں، ظلمات ایک کروڑ بھی ہوسکتی ہیں، لیکن نور ایک ہوگا: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ نُوْرًا فَمَالَهُ مِنْ نُّوْرٍ﴾ [سورة النور:٤٠] جس کے لیے اللہ کی جانب سے نور نہ ملے، اس کے لیے نور کا کوئی اور ذریعہ اور سرچشمہ نہیں، جس مذہب کی اور دین کی فطرت یہ ہے کہ اس پر اس کو اصرار ہے کہ تنہا وہی حق ہے، جس کو اس پر اصرار ہے کہ نور وایمان کے حدود معین ہیں، اس کو اس پر اصرار ہے کہ اسلام ایک تمدن بھی رکھتا ہے، خالی عقائد کا نام نہیں ہے، جب مغربی تہذیب اپنے پورے تصورات کے ساتھ، اپنے پورے اقدارِ حیات کے ساتھ، پورے مقاصد کے ساتھ آئی تو اس کا اس سے ٹکراؤ لازمی تھا، ٹکراؤ ہوا اور خوب ہوا۔

مغربی تعلیم کی زہرناکی

پھر اس کے بعد ایک دوسرا سانحہ پیش آیا کہ اس ملک وقوم کے ذہین، کھاتے پیتے گھرانے کے نوجوانوں نے مغربی تعلیم حاصل کی، اور عوام اپنی اسی حالت پر رہے، وہ اسی

ورثہ کو اپنے سینے سے لگائے رہے، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ عوام کے تصورات اور عوام کے احساسات و جذبات سے اتنا بیگانہ بن گیا کہ جیسے ایک نئی قوم پیدا ہوتی ہے، یعنی دو نئی قومیں پیدا ہو گئیں، اور دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے محسوس کیا اور تجربوں کے بعد اس کو یہ معلوم ہوا کہ اگر وہ زندگی چاہتا ہے، قیادت باقی رکھنا چاہتا ہے، تو ضروری ہے کہ عوام کے اس دینی جذبہ کو اتنا فنا کر دے یا اتنا کمزور کر دے کہ وہ اس کے راستہ میں مزاحم نہ ہو، نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے تعلیم کے ذریعہ، ابلاغ کے ذرائع کے ذریعہ، صحافت کے ذریعہ، ادب و لٹریچر کے ذریعہ، یہاں تک کہ شاعری کے ذریعہ، عوام کی اس دینی حمیت کو، اس اسلامی غیرت کو اور ان کی اس ذکاوت حس کو ختم کرنے کی کوشش شروع کر دی، اب مستقل معرکہ پیش آیا ان ملکوں کو کہ انھوں نے دیکھا کہ اگر ہمیں رہنا ہے تو عوام اگر اسی طرح رہے، ان کے یہی احساسات و جذبات رہے، تو کبھی یہ عوام ہمارے خلاف صف آرا ہو سکتے ہیں۔

ترقی یافتہ مسلم ممالک کی المناک کہانی

میں یہ کہانی سنا رہا ہوں آپ کو مصر کی، شام کی، عراق کی، ترکی کی، میں نہیں کہتا کہ یہ ہر ملک کی کہانی ہے، اور خدا کرے اس ملک میں ڈرامہ کبھی اسٹیج نہ ہو، لیکن ہے یہ ترقی یافتہ مسلم ممالک کی کہانی، ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جو اسلام سے نہ صرف یہ کہ بیگانہ تھا، بلکہ اس کو اس سے ایک طرح کا بعد اور وحشت تھی، یہ عوام کا کیا حال ہے، یہ بالکل چھوئی موئی بن گئے ہیں، چھوئی موئی کو ہاتھ لگایا، اور وہ سمٹ آئی، شرما گئی، تو عوام کیا بالکل چھوئی موئی ہیں، ان کا عقیدہ اتنا کمزور ہے، ارے بھئی! اگر کچھ لوگ شراب پیتے ہیں، تو پھر اس میں کون سی ایسی مصیبت آئی، اور اگر ٹیلی ویژن پر یہ سب کچھ دکھلایا جاتا ہے، اور اس سے لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے، تو ایسی کیا قیامت آ جاتی ہے؟ وہ کھائیں پئیں، دکان اور کاروبار کریں، دولت پیدا کریں، ان کو اس سے کیا تعلق ہے، مذہب تو ایک پرائیویٹ معاملہ ہے، ان کے استادوں نے اور مغرب کی یونیورسٹیوں نے ان کے دل و دماغ میں یہ بات اتار دی ہے کہ مذہب تو ایک شخصی معاملہ ہے، اور مذہب کی بقا بھی اسی میں ہے کہ شخصی معاملہ رہے،

اور اب دنیا اسی طرح چل سکتی ہے کہ مذہب شخصی معاملہ سمجھا جائے، اُن کے ذہن نے پہلے سے اس کو قبول کرلیا، اب یہاں وہ آئے، تو دیکھا کہ عوام حکومت کے معاملہ میں دخل دیتے ہیں، تنقید کرتے ہیں، بات بات میں متاثر بلکہ مشتعل ہو جاتے ہیں، انھوں نے ایک نیا محاذ کھول دیا، جمال عبدالناصر کے دور میں مصری عوام کے خلاف مصر کی ساری طاقت اور اس کی مشینری لگ گئی، فوج پولیس بن گئی، مصر کے سارے وسائل و ذخائر اور مصری قوم کی ساری توانائیاں اور جو جماعت برسر حکومت تھی، اس کی ساری ذہانت اس جذبہ کے کچلنے میں لگا دی گئی جو اُن کے لیے کسی وقت بھی آگ کی صورت اختیار کرسکتی تھی، جو دور جمال عبدالناصر کی لیڈرشپ کا گزرا، یہ بجائے اسرائیل سے لڑنے کے، بجائے کمیونزم سے لڑنے کے، بجائے الحاد سے لڑنے کے، یہ پُرامن شہریوں سے لڑنے میں صرف ہوا، اور ان دینی اور اسلامی تحریکوں کے ختم کرنے میں خرچ ہوا، اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کے اثرات کہاں تک باقی رہے، یہ کہنا مشکل ہے، لیکن یہی حقیقی جنگ تھی، جو وہاں لڑی گئی، یہی حقیقی جنگ ہے جو شام و عراق اور لیبیا و تونس، الجزائر اور مراکش میں لڑی جارہی ہے، کہیں گرم، کہیں نرم، میں عرب ملکوں کے علاوہ کسی غیر عرب ملک کا نام نہیں لوں گا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

یہ مصنوعی کارزار پیدا کی ہے ان دو فلسفوں نے، ان دو متوازی نظام تعلیم نے، ہمارے مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ تو قال اللہ وقال الرسول کی تعلیم ہے، اور یہاں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ اس کی نفی کی تعلیم ہے، جب انگریزی دور اقتدار (غیر منقسم) ہندوستان میں آیا اور انگریزوں کا نظام تعلیم آیا تو اکبر نے وہ شعر کہا جس سے بہتر شعر آج تک جدید لادینی نظام تعلیم اور اس کے دوررس نتائج کے متعلق کسی نے نہیں کہا ہے، مغربی نظام تعلیم کے اثرات کے بارے میں اس سے زیادہ سادے الفاظ میں، اس سے زیادہ گہری حقیقت نہیں بیان کی گئی:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

انھوں نے اس حقیقت کو بیان کیا کہ فرعون نے اپنی غباوت اور کند ذہنی سے خواہ مخواہ اپنے خلاف اتنا پروپیگنڈہ کرایا، اور اپنے لیے اتنی مشکلات پیدا کیں کہ آج تک صحف سماوی تک میں وہ علامت ہے جبر واستبداد کی، وہ نظام تعلیم بدل دیتا، تو بجائے بدنامی کے نیک نامی ہوتی، بجائے اس کو جہالت کی ایک علامت سمجھ لینے کے علم کا سرپرست مانا جاتا، مربی مانا جاتا، اس کے نام سے کتنی یونیورسٹیاں قائم ہوتیں، کتنی اکاڈمیاں قائم ہوتیں، سعودی عرب میں بھی مغربی نظام تعلیم سے اب یہ کشمکش پیدا ہورہی ہے۔

ہر ایسے ملک کو جس کو اسلام کی خدمت کرنی ہے، اور جس کو اسلام کا جھنڈا بلند کرنا ہے، اپنے ملک کو اس ذہنی کشمکش سے بچانا چاہیے، اس لیے کہ اس ذہنی کشمکش کے شروع ہوجانے کے بعد پھر وہ ساری ذہانتیں اور قوت عمل وہ سب کی سب اس میں لگ جاتی ہیں، ملک کی تعمیر میں، ملک کو مستحکم کرنے میں، سالمیت کی حفاظت میں جو توانائیاں صرف ہونی چاہئیں، اس میں صرف ہوتی ہیں کہ کون جیتے، کون ہارے، کس کا فلسفۂ اخلاق، فلسفہ مابعد الطبعیات، کس کا فلسفۂ حیات غالب اور کارفرما ہے۔

میں اس جامعہ سے توقع کرتا ہوں کہ دوسری جامعات کے مقابلہ میں یہ اصلاحی قدم پہلے اٹھائے گی، اس لیے کہ جس مفکر اسلام سے اس کو نسبت ہے، وہ موجودہ نظام تعلیم سے غیر مطمئن تھا، وہ اسلامی ملکوں میں اس نظام تعلیم کے نافذ ہونے سے ہراساں اور ترساں رہتا تھا، وہ اگر زندہ ہوتے تو شاید مطالبہ اس کا کرتے کہ سب سے پہلے نظام تعلیم بدلا جائے، اس لیے کہ انھوں نے کہا ہے کہ یہ وہ تیزاب ہے جس میں انسان کی خودی کو ڈال کر بالکل تحلیل کردیا جاتا ہے:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ہوجائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

عمان میں ایک مکالمہ تھا، استاذ کامل الشریف جو آج کل وہاں وزیر اوقاف ہیں، وہ، میں

اور سعودی عرب کے ایک فاضل شیخ احمد جمال، تینوں سے سوال کیے جارہے تھے، یہ مکالمہ ریڈیو پر بھی نشر ہوتا تھا، مجھ سے کہا گیا: اس وقت کی سب سے بڑی مصیبت خصوصاً نوجوانوں کی پریشانی کا اصل سبب کیا ہے؟ میں نے کہا: زندگی کا تضاد، وہ بیک وقت اتنی متضاد چیزیں دیکھتے ہیں، گھر کا نقشہ کچھ دیکھتے ہیں، باپ دادا کی روایت کچھ سنتے ہیں، اسکول یا کالج جاکر کچھ سنتے ہیں، ادب پڑھتے ہیں اور لٹریچر دیکھتے ہیں تو اس میں کچھ اور دعوت پاتے ہیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر وہ تفریح حاصل کرتے ہیں، وہ ان کو کچھ اور دیتا ہے، اس نے ایسا کنفیوژن (Confusion) پیدا کردیا ہے، ایک ایسا دماغی تضاد اور انتشار پیدا کردیا ہے کہ فیصلہ نہیں کرپاتے، جب تک یہ حالت ہے کہ ایک گاڑی میں دو گھوڑے جتے ہوئے ہیں، ایک مشرق کی طرف لے جارہا ہے، ایک مغرب کی طرف لے جارہا ہے، اس گاڑی اور گاڑی پر بیٹھنے والے مسافر کا اللہ ہی حافظ ہے، یہ تضاد سوسائٹی سے، ہمارے نظام تعلیم سے ختم ہونا چاہیے۔

میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی گزارشات کو ختم کرتا ہوں، اور میں وائس چانسلر صاحب کا، جسٹس افضل چیمہ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے سفارش کی اور میں یہاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں سمجھتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ آپ کو یاد نہ رہیں، لیکن کم سے کم اقبال کا پیام تو آپ کو یاد رہے گا، اب میں اقبال ہی کے اشعار پر ختم کرنا چاہتا ہوں:

اے پیر حرم! رسم و رہ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا(۱)

---

(۱) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد) میں ۱۸؍جولائی ۱۹۷۸ء کو کی گئی تقریر، ماخوذ از "دعوت فکر و عمل" (ص ۱۲۵-۱۳۶)۔

اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت اور وہاں کی قیادت اور فکری رجحانات میں اس کے دوررس اثرات

امت مسلمہ اور عالم اسلام کی موت وزیست کا مسئلہ

بزرگان محترم اور رفقائے کرام!

میں اس فرصت اور صحبت کو جو زمانہ طویل کے بعد میسر آئی ہے، غنیمت سمجھتے ہوئے اور اس سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج ایک ایسے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک امت مسلمہ اور عالم اسلام کی موت وزیست اور وجود اور عدم وجود کے مرادف ہے، میں پوری دیانتداری اور یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ بین الاقوامی اسلامی اجتماع اس اہم اور نازک موضوع پر گہرائی، ہمدردی اور سنجیدگی سے غور کرتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی نتیجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، تو ہم اس کو ایک مبارک اور تاریخ ساز اجتماع کہہ سکتے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی تو وہ ملت اسلامی کی حیاتِ نو کا نقطۂ آغاز بن سکتا ہے۔

حضرات! آپ حضرات کی اجازت سے میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل اور وضاحت وصراحت کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں، موضوع کی نزاکت اور اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ کہانی بہت دور سے شروع کی جائے، اس لیے کہ یہ مسئلہ آج کا یا چند مہینوں اور

سالوں کا نہیں ہے، یہ ایک بہت قدیم مسئلہ اور پرانی مشکل ہے، جس کی جڑیں ملت کی زندگی اور تاریخ میں اندر تک پیوست اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

ایک نفسیاتی حقیقت

اس سلسلہ میں پہلی نفسیاتی حقیقت جس سے صرف نظر کرنا ناممکن ہے، وہ اسلامی معاشرہ میں ایسے اشخاص کا وجود ہے جن کو اس عقیدہ پر (جس پر اس معاشرہ کی اساس ہے) قلبی طور پر انشراح نہیں ہوتا، اور وہ ان حقائق ومبادی اور مقاصد اور اقدار پر یقین نہیں رکھتے جن کے لیے یہ معاشرہ زندہ اور کوشاں ہے۔

یہ دراصل ہر اس انسانی معاشرہ کا مزاج اور خاصہ ہے جو کسی مخصوص عقیدہ اور متعین حدود وقیود کا پابند ہے، اور جب اس معاشرہ اور جماعت کا کوئی فرد ان حدود کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اس کے دائرہ سے خارج یا اس کا باغی قرار دیا جاتا ہے، اور ان حقوق و امتیازات سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو اس کو اب تک حاصل تھے، برخلاف قومیتوں کے جن کا دروازہ ہر عقیدہ ومسلک اور ہر قسم کے صحیح اور غلط طرزِ زندگی اور کردار کے لیے کھلا رہتا ہے، اور ان کی صرف ایک شرط ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ یہ فرد اپنی قومیت تبدیل نہ کرے، حکومت یا ملک کے خلاف کوئی سازش نہ کرے، اور کسی قومی غداری کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔

یہ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، اور جن لوگوں پر اس معاشرہ کے اچھے برے کی ذمہ داری ہے، ان کے لیے سب سے سنگین مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ عنصر (جس نے اس عقیدہ کو کبھی اخلاص کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا یا کسی وجہ سے اس کو ہضم نہیں کر سکا تھا، یا کسی خاص سبب سے ہضم کرنے کے بعد اسے پھر خارج کر دیا تھا) اس مومن و مسلم معاشرہ کے دائرہ اور فریم کے اندر اس کے ایک جزو کی حیثیت سے زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا چاہتا ہے، اور اپنے مستقبل کو کسی خاص مصلحت یا مجبوری سے اس کے مستقبل کے ساتھ وابستہ کرتا ہے، لیکن بایں ہمہ اپنے کو اس کے مطابق ڈھالنا، اس کے رنگ میں رنگنا اس کو کسی حالت میں گوارا نہیں ہوتا، وہ اس معاشرے کے مسلّم و بنیادی حقائق اور تصورات اور صفات و خصوصیات پر

یقین نہیں رکھتا اور نہ اس کے اندر اس کے لیے کوئی گرم جوشی اور اخلاص پایا جاتا ہے، غور سے دیکھا جائے تو یہ بات فتنۂ ارتداد سے زیادہ خطرناک، فتنہ انگیز اور دوررس ہے، جس کی سنگینی سے ہمارا مسلم معاشرہ واقف ہے۔

نفسیاتی کشمکش

یہ مسئلہ اس وقت کچھ اور پیچیدہ بن جاتا ہے جب یہ عنصر اپنی ذہانت وہنرمندی سے، نیز عوامی اعتماد حاصل کرنے اور دوسروں پر چھا جانے کی وجہ سے زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے، اور پھر اس کے بعد پورے معاشرہ کو اس راستے پر لے جاتا ہے جو اس کے نزدیک الحاد و بے دینی اور اس کے طے شدہ اصولوں اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کے راستے ہیں، بعض اوقات اس کو ان مقاصد کی طرف بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا جاتا ہے، جو اس کے دین و عقیدہ کے سراسر منافی یا اس کے متوازی ہوتے ہیں، وہ ایک ایسی عمیق نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے جس سے زیادہ سخت کشمکش تاریخ انسانی، تاریخ اخلاق ونفسیات اور تاریخ مذاہب میں شاید ہی کبھی پیش آئی ہو، وہ موت وزیست کی درمیانی اور بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس سے اس کو کسی وقت چھٹکارا نہیں ملتا۔

فکری وذہنی ارتداد

اس قیادت کے اثر سے جو اپنے معاشرہ اور قوم کے دین وعقیدہ پر ایمان نہیں رکھتی، بلکہ اکثر اوقات اس سے برسرِ پیکار اور آمادۂ فساد رہتی ہے، فکری وذہنی ارتداد کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے، اور ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد جن کے پاس اخلاقی ونفسیاتی حفاظت کا کوئی سامان یا ایمانی وروحانی قوت کا کوئی ذخیرہ یا کوئی علمی وفکری حصار نہیں ہوتا، اس سمندر میں غرقاب ہو جاتی ہے، دولت کے پرستار، چڑھتے سورج کے پجاری، موقع پرست، ابن الوقت اس کا خصوصیت سے اور زیادہ آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں یا پھر دوسری شکل میں نفاق پورے معاشرہ میں عام ہو جاتا ہے، معاشرہ کی داخلی قوت ختم ہو جاتی ہے، اور اس کا پورا ڈھانچہ اندر اندر سڑنے لگتا

ہے، مکروفریب عام ہوتا ہے، سازشوں کی کثرت ہوتی ہے، غداری اور قومی خیانت کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں، ضمیر اور بڑی سے بڑی قابل احترام اور مقدس میراث کا سودا ارزاں اور آسان ہوتا ہے، ملک کے بڑے بڑے رقبے چند سکوں کے عوض فروخت کر دیے جاتے ہیں، جاسوسوں اور دشمن کے کارندوں اور ایجنٹوں کی بن آتی ہے، اور ان کو اس خدمت کے لیے کوئی بھی طریقہ اور حربہ استعمال کرنے سے دریغ نہیں ہوتا، یہ وہ صورت ہے جس کی نظیر کسی اور انسانی معاشرہ میں (جس کو یہ سخت آزمائش پیش نہیں آئی ہے یا جس کے عوام اور قیادت کے درمیان اتنی وسیع، گہری اور بنیادی ونظریاتی خلیج نہیں ہے) نہیں ملتی۔

حالات وواقعات کا منطقی نتیجہ

اس کے نتیجہ میں یہ معاشرہ کسی بیرونی دشمن یا اندرونی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا، اور اس کی اصل وجہ یہی ذہنی انتشار اور نفسیاتی کشمکش، قیادت اور اس کے دیے ہوئے اعلانات اور نعروں سے عوام کی بے تعلقی اور عدم دلچسپی ہے، یہ سب حالات وواقعات کا منطقی نتیجہ اور نفسیات انسانی کا طبعی خاصہ ہے، اور ان تمام ملکوں کی قدیم وجدید تاریخ اس پر گواہ ہے، جو اپنے قائدین وزعماء یا اپنے حکام وامراء کی محبت سے کبھی آشنا نہیں رہے، اور جہاں جمہور اور قیادت میں جذباتی ہم آہنگی اور فکری یکسانیت کبھی پیدا نہیں ہوسکی۔

اسلامی سوسائٹی اور نفاق

البتہ اس اسلامی سوسائٹی نے — جو خود دعوت اسلامی کی اساس پر قائم تھی اور جس نے نبوت محمدی کی آغوش تربیت میں پرورش پائی تھی — اس طبعی اور تاریخی حقیقت اور امر واقعی کا کامیابی سے مقابلہ کیا جس کا واسطہ قدرتی طور پر ہر اس جماعت کو پڑتا ہے جس کی تعمیر ایمان و عقیدہ، دیانت وتقویٰ اور دعوت و جہاد کی بنیادوں پر ہوئی ہو، نفاق کی بیماری تو صرف اس ماحول کو لگتی ہے جہاں دو حریف نظریات اور مقابل قیادتیں پائی جاتی ہوں، خواہ ان دونوں میں ضعف وقوت اور قلت وکثرت کے لحاظ سے کوئی تناسب نہ ہو، اس موقع پر وہ متردد عنصر سامنے

آتا ہے جو ان دونوں مخالف کیمپوں کے درمیان گھومتا رہتا ہے اور متردد رہتا ہے کہ ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے اور کس کا دامن تھاما جائے؟ پھر کسی نہ کسی دعوت کی طرف مائل ہو کر اس میں شامل ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی محبت و تعلق کا مرکز بنا لیتا ہے، تاہم اس کی مادی مصلحتیں اور حریف کی قوت اور عروج و اقبال اس کو اپنے موقف کے اعلان، اپنی رائے کے اظہار اور نئی دعوت کو بالکلیہ قبول کرنے سے باز رکھتا ہے، اور مقابل دعوت سے اپنی رسم و راہ قطعی اور آخری طور پر ختم نہیں کرتا، قرآن مجید میں اسی کیفیت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:

﴿مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ لَآ إِلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ﴾(سورة النساء:۱۴۳)

''بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں، نہ ان کی طرف (ہوتے ہیں) نہ ان کی طرف۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:﴿وَمِنْهُم مَّن يَّعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ﴾(سورة الحج: ۱۱)

''لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کنارے پر (کھڑے ہو کر) خدا کی عبادت کرتے ہیں، اگر ان کو کوئی دنیاوی فائدہ پہنچے تو اس کے سبب مطمئن ہو جائیں، اور اگر کوئی آفت آ پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائیں (یعنی پھر کافر ہو جائیں)۔''

اسی لیے جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ مکہ میں نفاق کا وجود نہ تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی اسلام وہاں مغلوب تھا، اس کے اندر نفع و نقصان پہنچانے اور تغیر و تبدل کی کوئی طاقت نہ تھی، اور وہاں دو متوازی قوتیں نہ تھیں، مشرکین بڑے طاقتور اور غالب تھے، مسلمان مظلوم، نہتے اور مغلوب تھے، جب اسلام مکہ سے مدینہ منتقل ہوا اور اسلامی سوسائٹی اپنے تمام لوازمات اور طبعی خاصیتوں کے ساتھ وجود میں آئی تو نفاق نے سر اٹھایا، یہ ایک ایسی قدرتی اور نفسیاتی صورت حال تھی جس سے کوئی مفر نہ تھا۔

منافقین کو تسلط کیوں کر حاصل ہوا؟

لیکن رسول اللہ (ﷺ) کے تشریف فرما ہونے اور سلسلۂ وحی کی وجہ سے یہ نوزائیدہ سوسائٹی ان منافقین کے ضرر سے محفوظ رہی، قرآن مجید نے متعدد جگہوں پر ان کو اچھی طرح

بے نقاب کیا ہے، عام مسلمان بھی ان سے واقف اور بیزار و متنفر تھے، سوسائٹی نے بھی ان کو اپنے دائرہ سے خارج کر دیا تھا، اور ان کے لیے اس کے اندر چوری چھپے گھسنے اور خلل اندازی کرنے کا زیادہ موقع باقی نہیں رہا تھا، سوسائٹی کے اعتماد کو حاصل کرنے اور منصب واقتدار تک پہنچنے کی بات تو بہت دور کی تھی، چنانچہ یہ اولین اسلامی سوسائٹی برابر صحت منداور ان آلائشوں سے محفوظ رہی، نفاق اس کو کمزور اور کرم خوردہ نہ بنا سکا، اور منافقین کو بھی اس کو نقصان پہنچانے کا موقع نہ مل سکا، بلکہ ان کی کمزوری، شکست خوردی اور بد حالی کو دیکھ کر بہت سے صحابہ کو۔ جن میں بڑے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ان کی نسل ختم ہو چکی ہے، اور عہد نبوی کے بعد اب نفاق کا کوئی وجود نہیں رہا، لیکن نفاق پہلے بھی انسانی زندگی کا ایک خاصہ اور بہت سے لوگوں کی کمزوری تھا، اور آج بھی ہے، اس نے کسی وقت قافلۂ انسانی کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے، اور ہر موقع اور گنجائش سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی جگہ بنائی ہے، بہت سے اسباب وعوامل نے (جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) اس کی ہمت افزائی کی اور اس کو تخت سلطنت، حربی قوت اور انتظام حکومت کی منزل تک پہنچایا، نیز علم وادب کی محفلوں میں اس کو باریابی کا موقع دیا، اور یہ سب اس عہد میں ہوا جب اسلام پیش قدمی کر رہا تھا، فاتح وبا اقتدار تھا، اور اسلام قبول کرنے اور اسلامیت کا مظاہرہ کرنے میں بہت سے سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی فوائد بھی تھے، یہ وہ موقع تھا جب نفاق نے آگے بڑھ کر وسیع اسلامی سلطنت کے کلیدی اور اہم عہدوں پر قبضہ کر لیا، اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے کسی خاص فن یا صنعت میں اپنی مہارت کی وجہ سے یا غیر معمولی ذہانت یا علمی برتری کی وجہ سے نوزائیدہ اسلامی حکومت پر پورا تسلط حاصل کر لیا، اور ان میں بڑے اعلی درجہ کی انتظامی صلاحیتوں کے لوگ، افواج کے سپہ سالار اور ادباء واہل قلم اور حکومت کے اہل کار پیدا ہوئے۔

حضرت حسن بصریؒ کا تجزیہ

ان حالات میں ایک مرتبہ سیدنا حسن بصری (رحمۃ اللہ علیہ) سے نفاق اور منافقین کی موجودگی کے بارے میں سوال کیا گیا، درانحالیکہ اقتدار اسلام اور مسلمانوں کے ہاتھ میں

ہے، انھوں نے اثبات میں اس کا جواب دیا اور صرف ان کے وجود کی تصدیق نہیں کی بلکہ اس کا اظہار کیا کہ وہ طاقت کی پوزیشن میں ہیں، ان میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت! کیا آج بھی نفاق کا کہیں وجود ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ''اگر منافقین بصرہ کی گلیوں کو چھوڑ دیں تو تم کو ویرانی کی وجہ سے وحشت ہونے لگے۔'' ایک مرتبہ فرمایا: ''اگر وہ نکل جائیں تو تم اپنے دشمنوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکو۔'' ایک موقع پر کہا: ''خدا کی شان! اس امت کو منافقین نے کتنا نقصان پہنچایا اور کس طرح اس پر قبضہ کر لیا۔''(۱)

مغرب کی فکری و تہذیبی یلغار

اس کے بعد غیر ملکی اقتدار اور مغرب کی فکری و تہذیبی یلغار کا دور شروع ہوتا ہے، اور مشرق اپنے ارادہ سے یا بلا ارادہ مغربی طرزِ تربیت، نظامِ تعلیم، دبستانِ فکر، زندگی اور انسان کے مغربی تصور اور علوم و فنون کے مغربی زاویۂ نگاہ کے سایہ میں یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس کی گود میں اس طرح آ جاتا ہے جیسے کوئی شیر خوار بچہ کسی دیرینہ سال مربی و اتالیق کی آغوش میں چلا جاتا ہے، وہ اس کے پورے نظامِ تعلیم یا مختصر الفاظ میں اس کے نظریۂ تعلیم کو ساری خرابیوں اور خامیوں کے باوجود جوں کا توں قبول کر لیتا ہے، جو ایک ایسی سرزمین میں پیدا ہوا اور نافذ کیا گیا جس کے عقائد، بنیادی اصول، اخلاقی قدریں، اسلامی معاشرہ کی قدروں اور بنیادی و مسلمہ اصولوں سے ہر جگہ اور ہر سطح پر مختلف ہیں، جن پر وہ پورا ایمان رکھتا ہے، یا ان پر ایمان لانا، ان کے لیے جدوجہد کرنا، ان کے کچھ نہ کچھ قربانی دینا اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے، بلکہ مغرب کی اخلاقی قدروں کی تردید اور ان کی بیخ کنی اور تحقیر ہی پر اس کی بنیاد ہے، ایسی حالت میں اس کی مثال بعینہٖ اس شخص کی سی ہوتی ہے جو آبِ حیات کے شوق میں زہر کا پیالہ پینا چاہے یا کھارے اور نمکین پانی سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرے۔

انھوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور علمی اداروں کی تشکیل میں بیرونی ملکوں کے تعلیمی مشیروں کو پورا اختیار دے رکھا ہے، اور ان ملکوں سے صرف درسی کتابیں نہیں برآمد کر رہے

(۱) یہ اقتباسات محدث ابوبکر کی کتاب ''صفۃ النفاق وذم المنافقین'' (ص: ۶۸) سے ماخوذ ہیں۔

ہیں، وہ ان ملکوں میں اپنے تعلیمی وفود بھیجتے ہیں تا کہ وہ مغربی ماہرین تعلیم اور اساتذہ کی تربیت میں نشو ونما حاصل کریں، پھر ان کو ممالک اسلامیہ کے تعلیمی منصوبوں اور پالیسیوں کی تشکیل و تربیت کی پوری آزادی بھی دے دیتے ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کا نقشہ بنائیں اور ان کا جو رُخ چاہیں متعین کریں۔

اس کے نتیجہ میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنے عقائد وافکار اور اپنے اخلاق وسیرت، سب میں ذہنی انتشار کا شکار ہے، فکر مغربی اور فکر اسلامی کے درمیان تذبذب کی حالت بھی بسا غنیمت تھی، لیکن اس نے اکثر اوقات اپنے ملک وملت اور اپنے معاشرہ کے سارے معتقدات ومسلمات اور اصول واقدار سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

فکری اضطراب

یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی جس پر کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے، بلکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مقام تعجب تھا، ہوسکتا ہے کہ یہ ماہرین اور مشیران تعلیم اور ان کے شاگرد اپنے کام میں مخلص ہوں، اور اس تعلیمی پالیسی اور منصوبہ بندی میں ان کے پیش نظر اسلامی ملکوں اور نئی نسلوں کی فلاح وترقی ہو، لیکن یہ فرض کر لینے سے بھی ان ملکوں میں پیدا ہونے والے فکری اضطراب اور بنیادی تضاد اور ناہمواری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اور تصویر اسی طرح تاریک رہتی ہے، ان میں سے اکثر لوگوں کی اس خامی کو اس پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے کہ وہ دین سے اور اس کی بنیادوں اور اصولوں سے، مسلم اقوام کے مزاج وکردار اور ان کی شخصیت ودعوت کے مطابق اور منافی دونوں چیزوں سے واقف نہیں ہوتے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ان ملکوں اور قوموں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہوں، لیکن ان کو بچانے کی یہی کوشش ان کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتی ہے، ان غیر ملکی تعلیمی مشیروں کے سلسلہ میں مجھے Don Adams کا یہ تبصرہ بہت پسند آیا جو اس نے اپنی کتاب Educational Patterns In Contemporary Societies میں کیا ہے:

”ایک مشرقی حکایت غیر محتاط غیر ملکی تعلیمی مشیروں سے سرزد

ہونے والی غلطیوں کی پوری تصویر کشی کرتی ہے، کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا، جس میں ایک بندر اور ایک مچھلی پھنس گئے، بندر تیز طرار اور تجربہ کار تھا، لہٰذا ایک درخت پر چڑھ کر وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ مقام پر جا بیٹھا، اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ غریب مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے، پوری ہمدردی اور نیک نیتی کے جذبہ کے ساتھ وہ نیچے آیا اور اس نے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا، پھر جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔"(۱)

تعلیم کوئی تجارتی سامان نہیں

عہد حاضر کے ماہرین تعلیم نے بالاتفاق اس کا اظہار کیا ہے کہ:

"تعلیم کوئی ایسا تجارتی سامان نہیں ہے جو درآمد یا برآمد کیا جا سکے، مثلاً مصنوعات، کچا مال یا وہ ایجادات وضروریات جو کسی ملک اور علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ اپنا لباس ہے جو ان اقوام کے قد و قامت و جسامت کی ٹھیک ناپ کے مطابق تراشا اور سیا جاتا ہے، اور پسندیدہ ومحبوب علم وفن اور ان مقاصد کو سامنے رکھ کر تیار کیا جاتا ہے جن کے لیے وہ ہر طرح کی قربانی دے سکتی ہیں۔"(۲)

اور یہ کہ

"تعلیم صرف اس عقیدہ کو مضبوط کرنے کا ایک مہذب اور شائستہ طریقہ ہے، جس کا حامل یہ ملک یا قوم ہے، اس کا مقصد فکری طور پر اس کو غذا دینا، اس پر اعتماد کرنا اور اگر ضرورت ہو تو علمی دلائل سے اس کو مسلح

---

(1) N.Thut And Don Adams: "Educational Patterns In Contemporary Societies", McGraw Hill Book Co. New York, Page:352

(۲) نحو التربية الإسلامية الحرة

کرنا ہے، وہ اس عقیدہ کے دوام و بقا کا وسیلہ اور بے کم و کاست آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ نظام تعلیم کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ والدین اور مربیوں اور نگرانوں کی اس سعی پیہم کا نام ہے جو وہ اپنی اولاد کو اپنے دین و مسلک پر قائم رکھنے کے لیے کرتے رہتے ہیں، اور ان کی اس طرح تربیت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ورثہ کے (جو انھوں نے اپنے آباء و اجداد سے حاصل کیا تھا) صالح و اہل وارث اور امین ثابت ہوں، اور ان کے اندر اس ثروت میں اضافہ اور توسیع اور اس کو ترقی دینے کی پوری صلاحیت ہو۔ (۱)

برطانیہ کے ماہرین تعلیم کی ایک رپورٹ میں یہی بات کہی گئی ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

''ریاست کا مفاد اس میں ہے کہ وہ دیکھے کہ اسکولوں کے ذریعہ قومی زندگی کے مکمل اجزاء نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے ہیں، اس کا کام ہے کہ یہ دیکھے کہ طلبہ قومی مفاد کے مقررہ معیار کی کارکردگی کو قائم رکھتے ہیں اور اسے ترقی دیتے ہیں، ریاست کی ظاہری تعلیمی سرگرمی کے پس پشت غیر مرتب لیکن معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ بچے قومی اور آبائی خصوصیات کے جانشین بنتے ہیں۔'' (۲)

F.W.Gard Ford نے اپنی کتاب Education & Social Purpose میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اولین طور پر تعلیم کے مقصد کو سماج کی روایات اور اس کے

---

(۱) اس کی تائید میں ملاحظہ ہو: مشہور ماہر تعلیم جان ڈیوی (John Dewey) کی فن تعلیم پر تصنیفات اور تحریریں نیز مقالہ: "Education" مندرجہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

(۲) Secondary Education with Special Reference to Grammer and Technical Schools, H.M.S.O. 1931, pp 147-148

موجودہ اقدار پر پرکھنا چاہیے، کیونکہ یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر اس کی خصوصیات اور بقا منحصر ہے، اور یہ بے حد ضروری ہے کہ ان دونوں کے درمیان دفعتاً کوئی بے ربطی نہ پیدا ہو، اس کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ترقی کی ہر کوشش سماج کے مسلم اقدار کی بنیاد پر ہو۔"(۱)

ایک اور ماہر تعلیم Vernon Mallinson کی شہادت میں اس سے زیادہ یقین اور صراحت سے کام لیا گیا ہے، وہ لکھتا ہے:

"ایک قسم کا ذہنی منشور جو پورے معاشرہ کے مشترکہ مقصد اور مشترکہ کوششوں کا آئینہ دار ہوتا ہے، ایک طرح یہ بڑے پیمانہ پر قومی جذبہ کی عکاسی کرتا ہے، اور ان خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے جو معاشرہ کے نصب العین کی خوبی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔"(۲)

مغرب کا طریقہ کار

مغرب اپنے سیاسی نظاموں اور مکاتب خیال کے اختلاف، نیز اپنے مشرقی و مغربی کیمپوں اور اپنی ساری قومی بیماریوں اور نقائص اور خامیوں کے باوجود اس تعلیمی پالیسی پر پوری طرح کاربند ہے، اور تعلیم و تربیت کے تمام شعبوں میں اس نے اس کو بتمام وکمال نافذ کر رکھا ہے، اور اس کے تمام تعلیمی پروگرام اور تعلیمی پالیسیاں اسی مقرر کردہ اصول کی تابع ہیں۔

سوویت یونین بھی جو انقلابی ذہن اور اپنی انتہا پسندی میں مشہور ہے، اس اصول کو نافذ اور جاری کرنے میں سرمایہ دارانہ جمہوری حکومتوں سے پیچھے نہیں رہا، بلکہ شاید اپنے اشتراکی نظریہ کی حفاظت اور انقلابی روح کی بنا پر اس اصول کو عملی جامہ پہنانے میں وہ ان ممالک سے بھی آگے ہے، ایک سرکاری حکم نامہ مجریہ ۱۲ رنومبر ۱۹۰۸ء میں یہ کہا گیا ہے کہ:

(۱) F.W.Gard Ford: Education & Social Purpose, London, (1962) Page: 46-47

(۲) An Introduction to The Study Of Comparative Education, London, 1957, Page 4

''ان خصوصیات کے حصول میں سماجی علوم (Social Sciences) کی تعلیم ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، مارکسزم، لینن ازم کا علم ہر فن کے ماہرین کے لیے اشد ضروری ہے، ہمارے نوجوانوں کی تربیت اس طرح ہونی چاہیے کہ ان میں بورژوا نصب العین اور احیاء پرستی کے خلاف تعصب کی روح سرایت کر جائے۔''(۱)

مغرب اس نقصان سے محفوظ کیوں؟

یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے مغرب اس نقصان سے محفوظ رہا جس کا شکار مشرق کے اسلامی و غیر اسلامی ممالک سب ہیں، چنانچہ آج مغرب میں عوام اور قیادت یا جمہور اور حکومت میں کسی گہری اور وسیع نظریاتی، ذہنی و فکری خلیج کا سراغ نہیں ملتا، وہاں صرف ایک طرز اور ایک آئیڈیل اور ایک قسم کے اصول و نظریات اور مقاصد اور نصب العین پائے جاتے ہیں، وہاں مختلف طبقات اور سوسائٹی کے افراد کے درمیان کسی قسم کی ذہنی اور نفسیاتی رسہ کشی نہیں، اور اسی وجہ سے یہ ممالک اندرونی سازشوں اور بغاوتوں سے محفوظ ہیں۔

مغرب کے بعد ان مشرقی ممالک کا نمبر آتا ہے جو مدت دراز سے اپنا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اور ان کو ان حقائق پر یقین نہیں جن کی ایمان بالغیب اور انبیاء کی تعلیمات و ہدایات پر بنیاد ہے، ان کے پاس متعین آسمانی تعلیمات یا محفوظ آسمانی صحیفے بھی نہیں ہیں، وہ صرف ان قومی روایات اور جماعتی و شخصی مفادات کی حامل ہیں جن کو یہ تعلیمی نظام اور پروگرام چیلنج نہیں کرتے، اور کسی جگہ ان دونوں کا کراس نہیں ہوتا، چنانچہ یہ ممالک بھی اسی طرح اس تضاد سے محفوظ ہیں جو مغربی نظام تعلیم پیدا کرتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انھوں نے اس نظام تعلیم سے صلح و صفائی کر لی ہے اور دونوں میں پوری مفاہمت پائی جاتی ہے، یا انھوں نے اپنے آپ کو ان تعلیمی و تربیتی نظریات کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اسی لیے انقلابات اور سازشوں کا

(۱) George S. Count: The Challenge Of Soviet Education, (McGraw Hill Book Co.,New York, 1957, Page 50-51:32)

تناسب یہاں بہت کم اور تضاد بھی بہت کم یا اتنا کمزور ہے کہ قومی زندگی پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، ملک سے غداری اور قومی خیانت کے واقعات شاذ ونادر ہوتے ہیں، اور یہاں بھی عوام اور رہنما طبقہ میں وہ وسیع خلیج حائل نہیں ہے جو ہمیں اسلامی ملکوں میں نظر آتی ہے، ان ممالک کے امراض اور ان کے عیوب دوسری نوع کے ہیں، اور اس کے اسباب وعوامل بھی بالکل دوسرے ہیں، جن کا تعلق ان کی تاریخ، ان کے قومی مزاج، مخصوص عقائد، دینی حاسہ کی کمزوری، شعور کی کمی اور نظام تعلیم وتربیت کے فساد سے ہے۔

اسلامی ممالک میں کشمکش کیوں؟

جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے، وہاں یہ کشمکش اور عجیب تضاد بڑے وسیع پیمانہ اور مختلف سطح پر پایا جاتا ہے، وہاں ایک طرف حکومت اور جمہور میں کشمکش ہے، دوسری طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں میں رسہ کشی ہے، تیسری طرف دیندار اور آزاد خیال اور ترقی پسند افراد دست وگریباں ہیں، اور یہ نتیجہ ہے اس نظام تعلیم کا جو مغربی ملکوں سے درآمد کیا جارہا ہے، یا مغربی ذہن اور نظام تعلیم کے خطوط پر خود ان ملکوں میں تیار کیا جارہا ہے، اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی نسل پیدا ہورہی ہے جو ان عقائد اور حقائق کو پوری طرح ہضم اور قبول نہیں کرپاتی جن پر اس کے معاشرہ اور اس امت کی بنیاد ہے، اس لیے کہ یہ نظام تعلیم جس طرح کے خیالات کی آبیاری اس کے دل ودماغ میں کرتا ہے وہ ان حقائق اور عقائد سے کھلے طور پر متصادم ہیں جو اس معاشرہ کے لیے ناگزیر ہیں، کبھی خارق عادت طریقہ پر یا کسی بیرونی اثر سے وہ اس کو قبول کرتی ہے تو لازماً اس کے نتیجہ میں یہ نظام تعلیم ضرور کمزور پڑتا اور دبتا ہے، لیکن ایسا بہت شاذ ونادر ہوتا ہے۔

جب یہ طبقہ اس نظام کے آغوش میں تربیت پاکر نکلتا ہے تو قوم کے عقیدہ، خیالات اور جذبات سے اس کی کشمکش شروع ہوجاتی ہے، اگر وہ قوی الارادہ ہوتا ہے تو وہ رجعت پسندی کے ملبہ کو (جیسا کہ اس طبقہ کے معین افراد یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں) راستہ سے ہٹا کر اپنی قوم وملک کو ماضی کے بارگراں سے رہائی بخشنا چاہتا ہے، اس موقع پر ایک ایسی طویل

کشمکش برپا ہوتی ہے جس پر ملت کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں بے دریغ خرچ ہوتی ہیں، اور اندرونی خانہ جنگیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو بیرونی جنگوں سے بڑھ جاتا ہے، یہ ان ممالک کا قصہ ہے جہاں ایسی قیادتیں برسر اقتدار تھیں جو انقلابی، قوم پرستانہ اور لادینی فلسفوں اور دعوتوں پر یقین رکھتی تھی۔

اگر اس طبقہ کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اور وہ طاقتور شخصیت سے محروم ہوتا ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے اندر ان عقائد اور مقاصد کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہو جاتی ہے، وہ آئے دن اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے، غیر ملکوں او ربیرونی طاقتوں سے ساز باز کر لیتا ہے اور عوام کے قومی جذبہ اور دباؤ اور علماء و دعوت دین کے علم برداروں کے اثر و رسوخ سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتا ہے، چنانچہ اس کے نتیجہ میں غداری کے واقعات بار بار پیش آتے ہیں اور یہ ممالک مستقل طور پر بے یقینی، خوف و دہشت، ذہنی انتشار اور شبہہ و بے اعتمادی کی فضا میں رہتے ہیں۔

از سر نو پورا نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت

اس غیر فطری اور غیر ضروری صورت حال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ اس پورے تعلیمی نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اس کو ختم کر کے نئے سرے سے ایک نیا نظام تعلیم تیار کیا جائے جو اس ملت اور امت کے قد و قامت پر راست آتا ہو اور اس کی دینی و دنیاوی ضروریات پوری کر سکتا ہو۔

یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ، اس کی سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت، وقت کی آواز اور اسلامیانِ عالم کا سب سے بڑا فرض ہے۔

''اس مسئلہ کا حل خواہ وہ کتنا ہی دشوار نظر آ رہا ہو اور صبر آزما اور وقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے اور اس کو امت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے مادیت،

خدا سے سرکشی، اخلاقی و روحانی قدروں سے بغاوت اور جسم و خواہشات کی پرستش کی روح اور اسپرٹ کو ختم کیا جائے، اور اس کے بجائے تقوی، انابت الی اللہ، آخرت کی اہمیت اور فکر، اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح اس میں جاری و ساری کر دی جائے، اس مقصد کے لیے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات و معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنی ہوگی، مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا ہوگا، اس کی قیادت و امامت کا انکار کرنا پڑے گا، اس کے علوم و نظریات پر علمی تحلیل و تجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ عمل کرنا ہوگا اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مغرب کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں نے انسانیت اور تہذیب کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

اس کے علوم کے ساتھ مواد خام (Raw Materials) کا سا معاملہ کرنا ہوگا، اور اس سے وہ چیزیں تیار کرنی ہوں گی جو ان قوموں اور ملکوں کی اپنی ضروریات، رجحانات اور ان کے عقیدہ و تہذیب سے ہم آہنگ ہوں۔

اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگ گراں ہیں اور نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہو سکتے ہیں، لیکن یہ تجدد پسندی، آزاد خیالی، اور مغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کو روکنے کا واحد طریقہ ہے، جس نے عالم اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کر رکھ دیا ہے، اور اسلام کے فکری اور اجتماعی ڈھانچہ اور ملت ابراہیمی کے شیرازہ کے لیے ایک چیلنج بن گئی ہے، اور جس کے نتیجہ میں مسلم اقوام کے پر جوش اسلامی جذبات، ان کی سادہ دلی اور گرمجوشی، ان کی قربانیاں اور سرفروشیاں اور اخلاص و وفا کی قیمتی سوغات (جس کا ان حکومتوں کے قیام اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی میں سب سے بڑا اور براہ راست دخل ہے) افرنگیت اور مغربیت کے تنور کی حقیر ایندھن بن رہی ہے، سادہ لوح، بے زبان، سچے اور مخلص مسلم عوام خاموشی اور سکون کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کی طرح کسی نامعلوم منزل کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں، اور یہ طبقہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا ہے۔"(۱)

(۱) نحو التربية الإسلامية الحرة ص۴۳-۴۵

عالم اسلام کا سب سے بڑا چیلنج

کیا آج کوئی اسلامی ملک اور کوئی اسلامی حکومت، کوئی بڑی اسلامی یونیورسٹی اس آواز پر لبیک کہہ سکتی ہے، اور اپنی ساری کوشش، توجہات اور ذرائع و وسائل اس اہم تعمیری اور انقلابی نقطۂ آغاز پر مرکوز کر سکتی ہے، جو بالآخر عالم اسلام کو اس سب سے بڑے خطرہ اور چیلنج سے، بلکہ مکمل تخریب کے اس عمل سے (جو جاری ہے اور جس سے بڑی عمومی، ہمہ گیر، دوررس قومی تباہی و بربادی ہمیں اقوام و مذہب اور تہذیب و تمدن کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی) بچا سکتی ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (سورۃالبقرۃ:۱۹۵)

"اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ﴾ (سورۃ الإسراء: ۳۱)

"اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا۔"

یہ قتل معنوی اس قتل جسمانی سے کسی طرح کم نہیں، اس زوداثر اور مہلک زہر میں جو چشم زدن میں انسان کو موت کی نیند سلا دے اور اس زہر میں جس میں انسان گھٹ گھٹ کر مرے، نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، اور قرآن مجید نے دونوں سے منع کیا ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ [سورۃ النساء:۲۹]

"اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، کچھ شک نہیں کہ خدا تم پر مہربان ہے۔"(۱)

---

(۱) ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر یکم نومبر ۱۹۷۵ء کو پڑھا گیا ایک اہم مقالہ، ماخوذ از "روداد چمن" از مولانا سید محمد الحسنیؒ (صفحہ ۱۷۲-۱۸۷)۔

نظام تعلیم وتربیت کا معاشرہ اور اس کے رجحانات سے گہرا تعلق ہے

تعلیم کی کامیابی وناکامی

مشرق ومغرب کے جدید وقدیم بہت سے ایسے ماہرین تعلیم وتربیت ہیں جو تعلیمی مسئلہ کو زندگی اور معاشرہ سے الگ رکھ کر زیر بحث لاتے ہیں، جیسے ان کا تعلق ایک عارضی اور وقتی تعلق ہو، یا وہ کوئی پُل ہے جس کے ذریعہ کوئی انسان دریا پار کر کے پھر اپنی تمام کیفیات و عادات کے ساتھ اپنے گھر واپس آجاتا ہے، چنانچہ وہ تعلیم کی کامیابی وناکامی کا اندازہ تعلیم یافتہ فرد کی معلومات، امتحان میں حاصل کردہ نمبر، ڈگریوں، چرب زبانی اور خوش لباسی سے کرتے ہیں، اور عملی ومعاشرتی معیاروں اور پیمانوں سے اس کی کامیابی کی جانچ پڑتال نہیں کرتے، بہت سے تعلیم کے دلدادہ افراد کسی ملک کی ترقی، بیداری اور اس کے ثقافتی معیار کا اندازہ اس ملک کی یونیورسٹیوں کی تعداد سے لگاتے ہیں، خواہ وہ ملکی زندگی میں کتنی غیر مؤثر کیوں نہ ہو، اور ان کی حیثیت اس ملک میں غیر ملکی سفارت خانوں کی ہو جس کا اس ملک کے معاشرہ اور اندرونی حالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بیشتر حالات میں تو یہ یونیورسٹیاں ہی معاشرتی تباہی، اور ذہنی واخلاقی انتشار، بے راہ روی، بددلی واضطراب، بیکاری ومایوسی کا گھر

ہوتی ہیں، اور وہاں کے طلبہ وفارغین بے راہ روی وبے چینی کے نقیب بن جاتے ہیں، جیسا کہ آج کل کے بہت سے مشرقی وایشیائی ملکوں میں دیکھنے میں آرہا ہے۔

اسلامی مفکرین کی ذمہ داری

یہ تقلیدی اور غیر شعوری طرز فکر بدلنا چاہیے، اور ہم مسلمانوں کو (جن میں سرفہرست مفکرین و ماہرین ثقافت ہیں) دوسروں سے بڑھ کو حقیقت شناس، واقعیت پسند، انصاف پرور اور حق وصداقت کی گواہی دینے والا ہونا چاہیے، نہ یہ کہ ہم تخیلات وشاعری کے غلام اور لکیر کے فقیر ہوکر رہ جائیں، اور اس لیے ہمیں اپنا محاسبہ اور ایک سمجھدار وسنجیدہ تاجر کی طرح اپنے نفع نقصان کا موازنہ کرتے رہنا اور دیکھنا چاہیے کہ کتنی مسافت ہم نے طے کی اور کتنی باقی ہے، اور ہمارے فطری پروگراموں اور کاغذی منصوبوں اور عملی کامیابی اور حقیقی نتائج کا تناسب کیا ہے؟

دعوت وتعلیم اسلامی کی پہلی تجربہ گاہ

یہ ملک تعلیمات اسلام اور دعوت اسلام کی پہلی تجربہ گاہ ہے، اسی پاک سرزمین پر دنیا نے سب سے پہلے صدق واخلاص، وفاداری وجاں نثاری، جواں مردی و بہادری کے بے مثال مناظر دیکھے تھے، یہ تاریخ کا وہ صفحۂ زریں ہے جس کی ہر سطر نورانی ہے، اور جو یہاں کے رہنے والوں اور یہاں کے آنے والوں کو یکساں طور پر ایمان وعقیدہ اور سیرت و اخلاق کا درس دیتا ہے، یہاں تاریخ اسلام اس طرح مجسم ہوکر آجاتی ہے جسے ہر انسان آسانی سے سمجھ سکتا اور آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، جبکہ مغرب کی مشہور یونیورسٹیاں اور ثقافتی مراکز علمی حقائق ومفاہیم کو ذہن نشین کرنے، تاریخی واقعات اور قدیم تہذیبوں سے لوگوں کو روشناس کرنے کے لیے اسٹیج اور ڈراموں کا سہارا لیتے ہیں، اور آثار قدیمہ اور پرانے شہروں کے لیے سفر کراتے اور نمائشوں اور کانفرنسوں کا اہتمام کرتے ہیں، جہاں طالب علم کچھ وقت ایک خاص تاریخی وتہذیبی فضا میں گزارتے ہیں، جو گردوپیش کی فضا سے مختلف ہوتی ہے، اس

طرح وہ عہد ماضی کی یادیں تازہ کرتے ہیں، مگر یہ سب مصنوعی کاوشیں ہیں جو حقیقت سے دور ہوتی ہیں۔

لیکن یہاں رہنے والے طالب علم کے ذہن میں اسلام کے معانی و مفاہیم موجود ہی نہیں ہوتے، بلکہ وہ انھیں میں زندگی گزارتا ہے، اس صحرا کا ہر ذرہ اور اس جزیرہ کا ہر پہاڑ اسلام کی گذشتہ تاریخ کے کسی نہ کسی واقعہ کی خبر دیتا ہے، اور اس جزیرہ کی دعوت و پیام اور اس کی راہ میں بہنے والے پاک خون کا پتہ دیتا ہے، اور زمانۂ جاہلیت کے دور فقر و جہالت، اور گمنامی کے بعد پھر اسلام کے عطا کیے ہوئے علم اور اس کے لائے ہوئے دور خوش حالی و اقبال مندی کی تصویر کھینچتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ اس کا فخر کس کو حاصل ہے، اس حیرت انگیز انقلاب و تغیر کا سرچشمہ کیا ہے، جس کی تاریخ انسانی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

مرکز حج وعبادت

پھر ان شہروں کو اللہ تعالیٰ نے حج کا مرکز بنایا ہے، اس لیے ان میں ایک غیر معمولی روحانی کشش ہے، وہ نفوس وقلوب پر ایسا اثر ڈالتے ہیں جو دنیا کا کوئی شہر نہیں ڈال سکتا، دنیا میں کہیں اتنے مومن دل، پاک وسعید اور گرم جوش روحیں رکھنے والے ایک جگہ جمع نہیں ہوتے، جنھیں ایمان و ذوق وشوق، مرکز اسلام اور گہوارۂ وحی کی محبت کشاں کشاں لاتی ہے، اور جو اس جذبہ کے ساتھ یہاں آتے ہیں، جیسے پروانہ روشنی پر اور پیاسا پانی پر گرتا ہے، ان کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ پلکوں کے بل چل کر یہاں آئیں، چنانچہ اس راہ میں وہ قیمتی سے قیمتی چیز کو بھی ہیچ سمجھتے ہیں، اور بڑی سے بڑی تکلیف اٹھالیتے ہیں، اس طرح یہ فضا ذوق وایمان کی برقی لہروں سے بھر جاتی ہے، اور بجھی ہوئی طبیعتوں اور بے جان دیواروں اور خشک لکڑیوں کو بھی اس کا جھٹکا لگتا ہے، کوئی اس ایمانی مدرسہ سے بھی زیادہ سرگرم مدرسہ بتا سکتا ہے جو علم واخلاق کے پیغام کو اس خوبی سے دلوں میں اتار سکتا اور طبیعتوں میں وہ قوت پیدا کر سکتا ہو جو مادی دھاروں اور عصری رجحانات پر قابو پالے؟

ان شہروں کی زبان عربی ہے، جس میں قرآن مجید نازل ہوا، جو رسول اللہ (ﷺ) کی مادری زبان ہے، اور جس میں قرآن دنیا کے ہر ملک میں پڑھا جاتا ہے، اور جس میں اذانیں ہر خطۂ ارض سے بلند ہوتی ہیں۔

بحمد اللہ اس جزیرہ میں دو دین نہیں، یہاں ایک ہی دین ہے، اور وہی حکمراں ہے، پھر اخیر میں اللہ تعالیٰ نے سعودی حکومت کو شعار اسلام کو سربلند کرنے اور شرعی حدود وقوانین کے اجراء ونفاذ کا شرف عطا کیا، اور یہ حکومت دعوت اسلامی، توحید وسنت، اور اتباع سلف صالح کی بنیادوں پر قائم ہوئی، اس سے صالح وباشعور مسلمان کے نشو ونما کے لیے ایک سازگار فضا پیدا ہوئی، تعلیم وتربیت کی سہولت حاصل ہوئی، اور وہ تمام رکاوٹیں دور ہوئیں جن سے وہ مسلمان ملک دوچار ہیں جن کو صحیح اسلامی قیادت اور اقتدار نصیب نہیں۔

تعلیمی کوششوں کا نتیجہ

حضرات! ہم یہاں ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس سب کے بعد کیا یہ بات سو فی صدی یقینی اور متوقع نہ تھی کہ یہاں کا تعلیم یافتہ نوجوان بلند اخلاق، حسن سلوک، ضبط نفس، صبر وتحمل، سرگرمی، عالی ہمتی، اور اللہ کے مہمانوں کے لیے ایثار میں، دور جاہلیت کے قبیلۂ قریش کی مہمان نوازی سے آگے ہونے میں ایک مثالی نوجوان ہوگا، اور یہاں کا تعلیم یافتہ فرد دوسرے ملکوں کے تعلیم یافتہ افراد سے زیادہ اخلاق عالیہ سے آراستہ ہوگا، اور جو علم وثقافت میں جتنا ہی آگے ہوگا، تہذیب واخلاق میں بھی اتنا ہی بلند ہوگا، کیونکہ اس کی تربیت بامقصد ومنصوبہ بند اسلامی ثقافت کی گود میں ہوئی ہے، جس پر گرانقدر رقوم صرف ہوئی ہیں، اور جس کے لیے اساتذہ ومعلمین کی ایک فوج سرگرم کار رہی ہے، اور یہ مدارس کعبہ کے سایہ اور مسجد نبوی کے صحن اور اسلام کے گہوارہ میں قائم ہوئے ہیں۔

ملک کی وزارت تعلیم کی تعلیمی کوششوں کا نتیجہ بہت قیمتی ہے، جس سے کوئی عاقل اور انصاف پسند انکار نہیں کرسکتا جو اس ملک کے ماضی وحال سے آگاہ اور اس سے باخبر ہو کہ پہلے یہاں جہالت کس قدر تھی، اور مدارس وتعلیمی مراکز حتی کہ ابتدائی مکاتیب کی بھی کتنی کمی

تھی، اور عرب کے بدو اور دیہاتی علم، اسلام اور انسانیت سے کس قدر دور تھے، جہالت اور عزلت گزینی نے ان میں کیسے وحشیانہ اخلاق، انسانی جان بلکہ مسلمان کی جان کی بے قدری، قتل و غارت گری کے عیوب پیدا کر دیے تھے، اور خارجی دنیا سے تعلق کے ذرائع اور ابتدائی تہذیب کے وسائل بھی کتنے محدود تھے، اس لیے جب ہم ماضی قریب کا حال سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک حیرت انگیز انقلاب، ایک لمبی چھلانگ نظر آتی ہے، جو نا قابل یقین ہونے کے لحاظ سے افسانوی معلوم ہوتی ہے، اس موقع پر ہم سعودی حکومت کی کوششوں اور ملک کو علمی و تہذیبی ترقی کی راہ پر لانے کی کاوشوں کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مگر نتیجہ اس وقت کہیں زیادہ کمیت و کیفیت کا حامل اور مزید حیرت و استعجاب کا سبب بنتا جب ذہنی تعمیر، سیرت سازی اور اخلاقی تربیت کے عوامل پورے طور پر کارفرما ہوتے، اور وہ تضاد ختم کر دیا گیا ہوتا جس کے اکثر مسلم ممالک شکار ہیں، تعلیمی مراکز (جن کا اثر ان کی دیواروں ہی تک محدود رہتا ہے) اور زندگی کے مواج سمندر کے درمیان یہ خلیج حائل نہ ہوتی، تعلیم اور ذرائع ابلاغ میں کامل ہم آہنگی اور ان داخلی و خارجی عوامل میں گہرا رابطہ ہوتا، وہ ایک لائن پر اور ایک مقصد کی طرف بڑھ رہے ہوتے۔

مادیت کا ہسٹیریا

یہاں میں اشارتاً راستہ کی بعض بڑی دشواریوں کا ذکر کروں گا جو ملک و قوم اور تعلیمی و تربیتی اداروں کے درمیان حائل ہیں، اور جو اگر ماہرین تعلیم اور اساتذہ و معلمین کی کوششوں کو یکسر ناکام نہیں بناتیں تو ان کے اثر کو محدود ضرور کر دیتی ہیں، جیسا کہ مندرج نکات سے ظاہر ہوگا:

۱۔ تعلیم جتنی بھی ترقی کر جائے اور دانش گاہوں اور جامعات کا جال کتنا ہی پھیلا دیا جائے، وہ اس وقت اپنے میٹھے پھل اور مطلوب نتیجہ نہیں دے سکتیں جب معاشرہ غیر معمولی اور تیز رو نفسیاتی یا اخلاقی کیفیت سے دوچار ہو، اور جس کو مادیت کا "ہسٹیریا" لاحق ہو، جس کے سبب اس پر کھوکھلے نمونوں، مادیت کی تقدیس اور اہل دُوَل کے احترام بیجا کی حکمرانی ہو، تو

ایسی صورت میں یونیورسٹیوں اور دوسری درس گاہوں کے فرزند حتی کہ مفکرین و محققین بھی اس سیلاب کے آگے نہیں ٹھہر پاتے، وہ اس تیزاب میں اس طرح تحلیل ہو جاتے ہیں جیسے گوشت کا ایک ٹکڑا کانِ نمک میں پڑ کر نمک بن جاتا ہے۔

اس لیے ملک کی معاشرتی حالت اور اس کے رجحانات و میلانات سے چشم پوشی جائز نہیں، بلکہ معاشرہ کو راہ راست پر رکھنے اور اس کو ان بیماریوں اور وباؤں سے بچانے کی ضرورت ہے جو اسے چوس رہی ہیں، یہ کام دینی و اخلاقی طریقوں، صالح ادب اور با مقصد صحافت کے ذریعہ ہو سکتا ہے، جس کو انسانیت کا پاس، خدا کی شرم اور لوگوں کی عزت و ناموس کا احترام ہو۔

رضا کارانہ خدمت کی ضرورت

۲۔ عملی نمونوں، اونچے طبقہ میں کفایت شعاری، سادگی و ایثار کی نظیروں، اہل علم میں رضا کارانہ اور لوجہ اللہ خدمت اور قربانی کی عملی مثالوں کی ضرورت ہے، اسوۂ حسنہ کے ایسے نمونے (جیسا کہ سب کو معلوم ہے) ہر قوم اور ہر زمانہ میں اپنا نفسیاتی اثر رکھتے ہیں، گذشتہ نسلوں میں انھیں نے زندگی اور جواں مردی کی روح پھونکی تھی، اور جس کے سبب صف اول کے علماء و اہل قلم، مفکرین و محققین، مصلحین و مجددین دیکھنے میں آئے، جنھوں نے اللہ کے لیے تعلیم و تدریس اور اصلاح و تجدید کا کام کیا، اور دنیا سے کسی صلہ و انعام کے طالب نہیں ہوئے، ان میں ایسے بلند قامت مفکر اور عبقری بھی ہوئے جنھوں نے بہت سے مواقع پر تاریخ کا رخ پھیر دیا،[1] لیکن ہمارے موجودہ مدرسوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ افراد تو بہتے دھارے کے ساتھ ہو گئے، اور زمانہ کی ہوا اور معاشرہ کے اس رجحان کا ساتھ دینے لگے کہ اپنے لیے بہتر مستقبل اور خوشگوار زندگی کے راستے کیسے ہموار کیے جائیں، اور اس مرض کا شکار ہو گئے اور ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جس کے لیے (Careerist) کا خطاب ہی زیادہ مناسب و حسب حال ہے۔

(۱) تفصیل کے لیے ہماری کتاب ''تاریخ دعوت و عزیمت'' ملاحظہ ہو

نشر و اطلاع

۳- ہر ملک میں نشر و اطلاع (Radio & Television) کا شعبہ تمام شعبوں سے زیادہ وسیع و مؤثر ہو گیا ہے، اور جو ''ترقی یافتہ مہذب'' ملکوں میں ہوا اور پانی کی طرح ضروری سمجھا جانے لگا ہے، جس کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اقدار کے تعین، اشیاء کے پیمانوں، اور میلانات و مرغوبات میں تبدیلی پیدا کرنے کا موقع صرف اسی کو حاصل ہے، اس کی حیثیت اس وقت قلب انسانی کی ہوگئی ہے، جو اگر ٹھیک رہتا ہے تو سارا معاشرہ ٹھیک رہتا ہے، اور اس کی خرابی سے سارا معاشرہ خراب ہو جاتا ہے، اس کے بعد صحافت کا نمبر آتا ہے، جو پڑھے لکھے لوگوں کے لیے جادو کا اثر رکھتی ہے، ذہن بناتی ہے، ذوق ڈھالتی ہے، اور جس کے اثر سے بقول اقبال:

ع جو تھا ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

کا ظہور ہوتا ہے۔

تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ کے درمیان ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب ہمارے اسلامی معاشرے میں مسلم نوجوان فکری انتشار اور تباہ کن تعطل کے دور سے گزر رہے ہیں، اور اس نے مصلحین، معلمین اخلاق کی مہم کو مشکل سے مشکل تر بنا دیا ہے، اور تعلیم و تربیت سے وابستہ لوگوں کو بعض اوقات یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کہیں یہ ساری سعی و جانفشانی ''کوہ کندن و کاہ برآوردن'' کے مرادف تو نہیں ہے؟

آج کا مسلمان نوجوان

آج کا مسلمان نوجوان ایک تلخ تجربہ اور خطرناک کشمکش سے گزر رہا ہے، وہ وزارت نشریات، صحافت اور ٹیلی ویژن سے انتشار انگیز ترغیبات و رہنمائی سے دوچار ہوتا ہے، اور ایسے نشریاتی پروگرام سنتا ہے جو اسلامی تربیت کے بچے کھچے اثرات کو بھی مٹا دینے پر تلے ہوتے ہیں، اس طرح وہ اس میں فکری بغاوت اور نفسیاتی اضطراب پیدا کر دیتے ہیں،

اخبارات و رسائل صبح صبح اسے متعفن و مسموم غذا فراہم کرتے اور کچھ اور پڑھنے سے پہلے جذبات کو برانگیختہ کرنے والا سامان مہیا کر دیتے ہیں، چنانچہ سب سے پہلے جن چیزوں پر اس کی نگاہ پڑتی ہے وہ شہوانی تصویریں، ہیجان پرور عنوانات، شک وشبہ پیدا کرنے اور ایمان ویقین کو کمزور کرنے والے مقالات ہوتے ہیں جنھیں وہ شوق و رغبت کے ہاتھوں سے لیتا ہے، پھر اس کے ہاتھوں میں ایسی علمی کتابیں آ جاتی ہیں جن کے نام اور عنوانات بھاری بھرکم اور مرعوب کن ہوتے ہیں اور جوان لوگوں کے قلم سے نکلی ہوتی ہیں جن کے فضل وکمال پر اس نوجوان کا ایمان ہوتا ہے، اس طرح وہ ایسا مواد پڑھتا ہے جو اس کے لیے دین، تاریخ اسلام، شریعت اسلامی کے، بلکہ زبان و ادب کے بھی اولیں سرچشموں و ماخذوں کو بھی مشکوک ومشتبہ قرار دیتا ہے، اور اسے اس امت کی صلاحیت، اس کے پیغام کی ابدیت، اور عربی زبان کی اہلیت وصلاحیت کی طرف سے شک میں مبتلا کر دیتا ہے، وہ افکار وخیالات اور علمی نظریات کے اس عجیب وغریب ''آمیزہ'' کو پانے کے بعد ایسی حیرانی میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کے مقابل کوئی حیرانی نہیں ہوتی، اور کوئی تعجب نہیں اگر پختہ فکر اور صاحب عقل ورائے انسان بھی حیرت میں پڑ جائے، چہ جائیکہ ایک خام فکر اور نوعمر جس کے شعور کی آنکھیں بھی نہیں کھلیں، اس سے یہ امید کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ متصادم دھاروں کے آگے ٹھہر سکے گا؟ یہ اس گاڑی کی طرح ہے جس کے دونوں طرف طاقتور گھوڑے جتے ہوں اور دونوں مختلف سمتوں میں اسے کھینچنے کی کوشش کر رہے ہوں، تو اس طرح اس کے سواروں کا حیرت میں پڑ جانا قابل حیرت نہیں، اسی طرح ہمارے نوجوانوں کو کسی کروٹ قرار نہیں۔

ادبی ارتداد

وہ ادب جو کم از کم نصف صدی سے ہمارے پاس آ رہا ہے، جس کے ہاتھ میں دینی و ذہنی رہنمائی کی زمام ہے، اس نے نئی نسلوں اور نوجوانوں بلکہ بہت سے بڑے بوڑھوں کے دلوں میں شک و بے چینی پیدا کر رکھی ہے، ان کو اپنے وجود کے ساتھ تمام بدیہیات ومسلمات

میں بھی شک لاحق ہوگیا ہے، ان کتابوں نے جن کی تصنیف میں محض سستی دولت وشہرت حاصل کرنے اور نوجوانوں سے داد وتحسین پانے کا جذبہ کارفرما تھا، ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں شک وحیرت اور تضاد وکشمکش پیدا کردی ہے۔

تفریحی سامان کی کثرت: ایک لمحہ فکریہ

اس کے ساتھ تفریحی سامان کی کثرت اور بے مقصد اور ہیجان خیز ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام بھی مشرق ومغرب کے ماہرین تربیت اور نوجوانوں کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے فکر وتردد کا باعث بن گئے ہیں، اس زیادتی نے نوجوانوں کو صبر وسنجیدگی، مطالعہ کی یکسوئی اور طالب علمانہ تیاریوں کے بجائے تفریح وآرام طلبی اور ہر اس چیز سے فرار سکھا دیا ہے جو محنت ومشقت اور دیدہ ریزی کی طالب ہو، اس صورت نے بہت سے ماہرین تربیت ونفسیات کو اس اعتراف پر مجبور کردیا ہے کہ اس رجحان نے بہت سے نوجوانوں کو مہم جوئی کے طور پر لوگوں کی جان ومال سے کھیلنے پر آمادہ کردیا ہے، اور زمام کار ماہرین تربیت اور خاندان کے سرپرستوں کے ہاتھ سے نکل گئی ہے، تعلیمی معیار حد درجہ پست ہوگیا ہے، کیونکہ ان پروگراموں نے اس کے وقت ومحنت کا بڑا حصہ گھیر لیا ہے، یہ ایک ایسا مسئلہ بن گیا ہے جو ماہرین تعلیم وتربیت کی پوری توجہ، فوری حل اور کامیاب علاج کا طالب ہے۔

مغرب میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان: سنگین خطرہ

۴- اس سے بڑھ کر اہمیت رکھنے والی وہ وبا ہے جو تمام مسلم وعرب ممالک میں پھیل گئی ہے، وہ بڑی تعداد میں نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ وامریکہ بھیجنے کا رواج ہے، حالانکہ نہ ان کو ذہنی پختگی حاصل ہوتی ہے نہ اخلاقی تربیت، یہ خطرہ اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب وہ عنفوان شباب کی منزل میں ہوں، جو طالب علم کی زندگی کا سب سے نازک وحساس (Sensitive) دور ہوتا ہے، اس وقت اگر یہ نوجوان ان وبا زدہ ملکوں کو بھیجے جائیں جہاں اخلاقی جذام پھیلا ہوا ہے، جہاں پاکیزہ زندگی اور اقدار کی بنیادیں متزلزل ہیں، اور ماہرین

تربیت کے ہاتھوں کے طوطے اڑ رہے ہیں، تو یہ اس ابھرتی نسل کو داؤں پر لگانا ہے جس کے ہاتھوں میں کل زمام اقتدار آنے والی ہے، اس کے بعد بھی یہ امید رکھنا کہ وہ مغربی ثقافت اور مفید مغربی علوم کے خوشگوار پھل پائیں گے اور اس کی برائیوں اور کڑوے پھلوں سے بچے رہیں گے، خوش گمانی کی انتہا اور فطرت اور آئین قدرت سے چشم پوشی کے مرادف ہے، خصوصاً جبکہ ان نوجوانوں کا قیام یورپی اور امریکی گھرانوں میں ہو، اور مخصوص بورڈنگ ہاؤس کا انتظام نہ ہو جس کا ماحول اسلامی ہو اور جہاں صالح علمی وفکری غذا بھی فراہم ہوتی ہو، تو مغربی تہذیب کے اس منجدھار میں ان غریب نوجوانوں کی زبان حال پر یہی ہوگا کہ ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش!

تعلیم نسواں

۵- اہمیت ونزاکت میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی کچھ کم نہیں، یہ قضیہ بھی بڑی دانش مندی، ذہنی وفکری جرأت اور "تعلیم نسواں" کے چلے ہوئے مفہوم کی تقلید سے آزادی کا طالب ہے، تعلیم نسواں کے موجودہ نظام کو مغربی اور مشرقی ملکوں نے ان حالات میں اپنایا ہے جو ہمارے حالات سے قطعاً مختلف ہیں، ہمارے ملکوں میں اس سلسلہ میں ایسی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جو ایجاد واختراع، جرأت وذہانت پر مبنی ہو۔

اقوام وملل کی تاریخ شاہد ہے کہ ان کے زوال وانحطاط کا سب سے بڑا سبب جس نے ان قوموں کو نیست ونابود کردیا ہے اور بڑی عظیم تہذیبیں فنا کے گھاٹ اتر گئی ہیں، خاندانی نظام کی ابتری، گھریلو زندگی کا عدم توازن اور عورتوں کی اس سے عدم دلچسپی، اس کی ذمہ داریوں سے فرار، بے حیائی کی حد تک بے پردگی، اور جاہلی زینت وآرائش ہے، ہم نے زوال آمادہ اور انحطاط پذیر معاشروں اور تباہی کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی قوموں میں ہمیشہ یہ مرض پھیلتے دیکھا ہے، جہاں عورتیں گھریلو زندگی اور اس کی ذمہ داریوں سے کترانے لگتی ہیں، فرائض مادری سے پہلوتہی کرنے لگتی ہیں، ان معاشروں میں عورتیں ان تمام ذمہ

داریوں سے الگ رہ کر مردوں کے کام اور ان کی سرگرمیوں میں شریک ہونے لگتی اور ان کے دوش بدوش چلتے ہوئے زندگی کے تمام میدانوں میں ان سے آگے بھی نکل جانا چاہتی ہیں، مغربی معاشرہ نے بھی یہی روش اپنائی جس کے نتیجہ میں خاندانی نظام اور معاشرتی توازن درہم برہم ہوگیا، اب مغرب کے ماہرین عمرانیات جرأت وصفائی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کررہے ہیں، لیکن اب معاملہ ان کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے، پانی سر سے اونچا ہوگیا اور پیمانۂ حیات چھلک پڑا ہے، اور وہ اس تہذیب کے قریبی خاتمہ پر پریشان و ہراساں ہیں۔

مقام عبرت ونصیحت

اب کسی بھی مشرقی اسلامی ملک میں اس نظام کی نقل اور اس ناکام تجربہ کا دہرانا ملک کی سالمیت اور شخصیت ودعوت کو خطرہ میں ڈالنا ہے، اس لیے ہمیں ان تجربوں سے عبرت حاصل کرنا اور خاص طور پر ان ملکوں میں اس کے اعادہ کی کوشش سے بچنا چاہیے، جن پر اسلام کے مستقبل کا انحصار ہے، "السَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهِ" (خوش بخت وہ ہے جو دوسروں کے حال سے عبرت ونصیحت اختیار کرتا ہے)۔

میں اپنی بات کو (جو کچھ طویل ہوگئی ہے اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی) اپنے ان آخری الفاظ پر ختم کرتا ہوں کہ اس ملک کی تعلیمی پالیسی، اصولی طور پر اسلامی حکمت عملی ہی پر مبنی اور عام طور پر تعلیمی نظام اسی پالیسی پر کاربند بھی ہے، حکومت سعودیہ تعلیم کے لیے اپنے وسائل سے بڑی عالی ہمتی اور فیاضی سے کام لے رہی ہے، اور قوم بھی نمایاں طور سے اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے، اور وہ فضا وماحول بھی موجود ہے جو اسلامی جذبات کو تازہ کرتا اور اسلامی دعوت کی یاد دلاتا رہتا ہے، یہ بات بڑی امید افزا اور روح پرور ہے۔

لیکن مقاصد اسی وقت بروئے کار آسکتے ہیں جب رکاوٹیں اور متضاد چیزیں ہٹادی جائیں، اور عوامل ومؤثرات اور تعلیم وتربیت کے درمیان کامل ہم آہنگی ہوجائے، اور وہ چور دروازے بند کردیے جائیں جن سے فساد، کمزوری، اور تضاد کو راہ ملتی ہے، خواہ وہ داخلی ہوں یا

خارجی، اور یہ ایسی مملکت کے لیے ناممکن بات نہیں جو دعوت وعقیدہ کی اساس پر قائم ہوئی ہے، جس نے ہر ملک کے اسلامی معاملات پر توجہ کی ہے، دور دراز علاقوں میں اسلامی دعوت و تعلیم کا بندوبست اور دنیا میں اسلامی اتحاد کا علم بلند کیا ہے، اور نہ یہ اس وزارت تعلیم کے لیے کچھ مشکل کام ہے جس کی سربراہی اصحاب دعوت وعقیدہ، صاحب غیرت، دینی فہم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں، اور اگر ایسا ہو گیا تو یہ معاصر اسلامی تاریخ کا ایک بڑا کارنامہ ہوگا اور ہر اسلامی ملک کے لیے مثال بن جائے گا:

﴿وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللّٰهِ﴾ [سورة الروم: ٤-٥] ''اور اس دن اہل ایمان اللہ کی نصرت کے ظہور سے فرحاں وشاداں نظر آئیں گے۔''(۱)

(۱) ۱۲ تا ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ (۳۱ مارچ تا ۸ اپریل ۱۹۷۷ء) کو مکہ مکرمہ میں اسلامی تعلیم پر ایک عالمی کانفرنس بلائی گئی تھی، جس کا اہتمام جدہ کی کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی نے کیا تھا، اور جس میں عالم اسلام اور مغرب کے کثیر التعداد ماہرین تعلیم اور دانشوروں نے شرکت کی تھی، حضرت مولاناؒ کا موضوع ''سعودی عرب کا نظام تعلیم اور اس کا بہترین طریقہ اور اس کی مشکلات کا ازالہ'' تھا، حضرت مولاناؒ نے یہ تقریر ۱۹ ربیع الآخر ۱۳۹۷ھ (۱۷ اپریل ۱۹۷۷ء) کو اس جلسہ میں کی تھی جس کی صدارت امیر محمد ملک فیصل نے کی تھی، اس تقریر کا یہ اقتباس حضرت مولاناؒ کی کتاب ''حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب: امیدوں اور اندیشوں کے درمیان'' (صفحہ ۷۷ تا ۹۰) سے ماخوذ ہے۔

نظام تعلیم وتربیت کی بنیادیں

حکمت مومن کی گم گشتہ دولت ہے

حضرات! میں اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس مقدس ملک میں تعلیم وتربیت جیسے اہم موضوع پر گفتگو کرنے کا مبارک موقع عطا فرمایا، اور مجھ جیسے فقیر بے نوا کے ساتھ اس قدر حسن ظن اور اعتماد کا مظاہرہ کیا، یہ جہاں آپ حضرات کی عالی ظرفی، وسعت قلبی، اس موضوع سے آپ حضرات کی دلچسپی اور نبی (ﷺ) کے اس فرمان پر کامل ایمان کی دلیل ہے کہ "حکمت مومن کی گم گشتہ دولت ہے، یہ جہاں بھی ملے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے"(۱) ساتھ ہی ساتھ اس ملک کے متعلق آپ حضرات کے نقطۂ نظر کا بھی اس سے اظہار ہوتا ہے کہ آپ اسے مسلمانوں کا اولیں اسلامی وطن قرار دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ اس کے حالات ومسائل سے دلچسپی لے، اپنے اعلیٰ ترین جذبات اس پر قربان کردے، اپنے تجربات کا قیمتی اثاثہ اس کی نذر کردے، اور اپنے علم وعقل اور قلب وضمیر کے شعور واحساسات کا خلاصہ اور ان کا عطر نکال کر اس کے حضور پیش کردے۔

جہالت کے خلاف جنگ

اس قابل رشک مقام پر کھڑا ہوا میں ایک ذہنی کشمکش سے دوچار ہوں، دو شدید اور باہم

(۱) رواه الترمذي في جامعه، أبواب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، حديث رقم ٢٦٨٧

متضاد احساسات میرے دل و دماغ کو متاثر کرنا چاہتے ہیں، پہلا احساس مسرت وشادمانی، حقائق کے اعتراف اور قدر شناسی کا احساس ہے، کیونکہ جب میں اس وسیع وعریض ملک میں کالجوں، اسکولوں اور ابتدائی مدارس کا جال پھیلا ہوا دیکھتا ہوں جس سے نہ کوئی بڑا شہر چھوٹا ہے، نہ چھوٹے سے چھوٹا دیہات باقی بچا ہے، اور اس ملک میں علم وفن کی اشاعت کے لیے مخصوص کی ہوئی بڑی بڑی رقموں کو دیکھتا ہوں جس پر اس زمانہ کی کوئی بھی انتہائی ترقی یافتہ حکومت فخر کر سکتی ہے، اور ان اساتذہ اور معلمین کی تعداد پر نظر ڈالتا ہوں جو باہر سے بلائے گئے ہیں، اور برابر بلائے جا رہے ہیں، جن کی پذیرائی اور اعزاز واکرام میں وزارت تعلیم کی جانب سے کوئی کسر نہیں چھوڑی جا رہی ہے، اور سعودی طلبہ تعلیم کی ہر منزل میں جن رعایتوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور ہر طرح سے ان کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے، جس کو باپ کی شفقت اور ماں کی محبت سے موسوم کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، اور مغرب و مشرق کے متعدد ممالک میں جس کی مثال نہیں ملتی، اسی طرح جہالت کے خلاف جنگ میں وزارت تعلیم کے ذریعہ حکومت کی جدوجہد پر نظر ڈالتا ہوں، پھر تعلیم کی طرف ترکوں اور شرفائے مکہ کی حکومتوں کی توجہ اور اس حکومت کی توجہ وانہماک کا موازنہ کرتا ہوں، اور سابق حکومتوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد، اور اس حکومت میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد کا مقابلہ کرتا ہوں، تو میرے دل و دماغ میں مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے، اور مملکت سعودیہ عربیہ کے مرتب کیے ہوئے حالیہ محیر العقول تعلیمی پروگرام کی عظمت کے اعتراف پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں، تعلیمی ترقی کا یہ بلند معیار مجھے حیران و بے خود کر دیتا ہے، اور حقیقت حال کے اعتراف اور ان ذمہ داروں کی مدح وستائش کے علاوہ کسی بات کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی جن کے سر یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دینے کا سہرا بندھتا ہے۔

تعلیم وتربیت کے میدان میں مملکت سعودیہ عربیہ نے مختصر سی مدت میں طویل ترین مسافت طے کر لی ہے، اور چند ہی سالوں میں جاہل اور ان پڑھ گنواروں میں لکھنے پڑھنے کا عام رواج ہو گیا ہے، جن سے دیہات کے علاوہ شہر بھی بھرے پڑے تھے، اور مدارس میں

اپنی تعلیم مکمل کرنے والوں، مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں اوراونچی اونچی ڈگریاں حاصل کرنے والوں، مختلف تحقیقی موضوعات میں خصوصی استعداد پیدا کرنے والوں اور متعدد غیر ملکی زبانوں کے ماہرین کی ایک فوج تیار ہوگئی ہے، یہ سارے حقائق وزارت تعلیم کی کامیاب جدوجہد اور موجودہ حکومت کے کارناموں پر حیرت آمیز مسرت کا احساس پیدا کرتے ہیں، اور مسرت کا یہ قوی احساس دل و دماغ پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ کسی دوسرے پہلو پر غور وفکر کا موقع ہی نہیں دیتا، اور پر جوش مبارکباد پر مجبور کر دیتا ہے۔

مسرت وشادمانی کا احساس

میں اس وقت اگر کسی ایسے ملک میں ہوتا جو پلک جھپکتے ہی وجود میں آیا ہو، اور بس صبح و شام ہی میں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آ گیا، جنگلی اور وحشیانہ طرز زندگی کو چھوڑ کر متمدن زندگی اختیار کر لی، اس کی کوئی ایسی خصوصیت وامتیاز نہیں جس پر وہ فخر کرتا ہو، نہ وہ کسی پیغام کا حامل ہے، نہ اس کے سامنے کچھ مخصوص ومتعین عقائد واصول ہیں، جن پر وہ ایمان رکھتا ہے اور جن کے ساتھ جسم و جان اور لفظ ومعنی کا سا ارتباط وتعلق رکھتا ہے، نہ اس کے پاس انسانیت کے لیے کوئی مخصوص ومعروف دعوت ہے، نہ اس کے ماضی کی شاندار تاریخ ہے جس سے وہ بہتر اور بلند افکار و اقدار اخذ کر سکے، اور اس سے اپنے اندر قوت و اعتماد پیدا کر سکے، اگر میں اس وقت کسی ایسے ہی نومولود ملک میں ہوتا جو انسانی زندگی اور انسانی مسائل اور معاصر قوموں سے اگر کوئی تعلق رکھتا ہے تو صرف پیٹ اور معدہ یا صنعت وحرفت یا لہجہ اور زبان یا مصوری وخطاطی کا یا صرف سیاسی اور سفارتی تعلقات رکھتا ہے، تو صرف یہی احساسِ مسرت وشادمانی اور اعتراف وقدرشناسی کا احساس- میرے افکار واقوال پر چھایا رہتا۔

خوف واندیشہ

دوسرا احساس یا دوسرا جذبہ خوف واندیشہ کا جذبہ ہے، اور سچی اور پر خلوص محبت ہمیشہ خوف واندیشہ کا باعث بنتی رہی ہے، اور محبت کے ساتھ جذبۂ غیرت وحمیت کا وجود بھی ہمیشہ

لازمی رہا ہے۔

خوف واندیشہ کی وجہ یہ ہے کہ اس جزیرہ نما کو حکمت الٰہی نے صدیوں پہلے سے ایک امتیازی حیثیت کا حامل بنایا ہے، جو اس کی طبیعت اور فطرت میں رچ بس گیا ہے، اور طویل اور سخت تاریخی سفر میں ہر منزل پر اس کی یہ امتیازی حیثیت برقرار رہی ہے، خواہ وہ سفر سیدھا اور آسان رہا ہو، یا پیچدار اور دشوار گزار، کسی حالت میں معمولی وقت کے لیے بھی اس کا یہ طبعی اور فطری وصف زائل نہیں ہوا، اور طبعی، تاریخی، اخلاقی اور اجتماعی سارے عوامل اس معاملہ میں اس کے مددگار ہی ثابت ہوئے ہیں، بلکہ ان عوامل کا تقاضا تھا کہ یہ جزیرہ نما اپنے اس امتیاز کو باقی رکھے، اور اس کی حفاظت کرتا رہے، نیز یہ جزیرہ نما انسانیت کی فلاح و کامرانی کے لیے ایک پیغام کا حامل رہا ہے، اللہ نے اس کو اس پیغام کے لیے اور اس پیغام کو اس علاقہ کے لیے منتخب فرمایا ہے، اور دونوں کے مصالح ایک دوسرے سے متعلق ہیں، ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوئی بھی کوشش شرمناک اور مجرمانہ کوشش قرار دی جائے گی، مزید برآں یہ ایک غیر فطری کوشش ہوگی جو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔

احتساب وجہاں بانی

انہی دونوں تاریخی اور طبعی حقیقتوں نے جزیرۃ العرب کو تاریخ کے ہر دور میں مرکزی مقام عطا کیا ہے، اور قیادت ورہنمائی اور احتساب وجہاں بانی کے بلند منصب پر فائز کیا ہے، اور دوسروں کی نقالی، تقلید، اتباع اور غیروں کی شاگردی اور طفیلی پن کے مقام سے بہت بلند کردیا ہے، دوسروں کے بنائے ہوئے پروگرام کو نافذ کرنا، ان کے نقشوں میں رنگ بھرنا، یا اوروں کے علوم وتجربات کو من وعن قبول کرلینا، اس کی شان کے منافی ہے، تہذیب وتمدن کا مسئلہ ہو یا طریقِ تعلیم ونظامِ تربیت، ہر معاملہ میں خودشناسی وخوداعتمادی اس کا فطری تقاضا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس ملک کا تعلیمی مسئلہ اتنا سادہ اور آسان نہیں جتنا بہت سے ماہرین تعلیم وتربیت سمجھتے ہیں، اس مسئلہ میں کامیابی اور مشکلات پر قابو پالینے کا اندازہ صرف اس سے نہیں کیا جاسکتا کہ عوام میں پڑھنے لکھنے کا رواج بہت ہوگیا ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کے بے شمار

مدرسے قائم ہوگئے، کالجوں اور اسکولوں کی بڑی تعداد وجود میں آ گئی، بعض یونیورسٹیاں بھی قائم ہوگئیں، اور ان میں تعلیم مکمل کرنے والوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے، بڑی تعداد میں طلبہ دنیا کے مختلف تعلیمی مراکز میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جا رہے ہیں، اور امتیازی کامیابیوں کے ساتھ واپس ہو رہے ہیں، اور مختلف تعلیمی اور انتظامی ذمہ داریاں سنبھال رہے ہیں۔ ہاں، ممکن ہے اسے افریقہ کے کسی گمنام ملک کے لیے کامیابی کا اعلیٰ معیار قرار دیا جائے جو جدید تہذیب و تمدن کے زمرہ میں نیا نیا داخل ہوا ہو۔ یہاں تک کہ بدھ ازم کے پرستار جاپان اور برہمنیت کے پیروکار ہندوستان نے بھی ناخواندگی اور جہالت کے خلاف جدوجہد اور محض علم وفن کی اشاعت کو اپنی منزل مقصود اور معیار کمال بنانا پسند نہیں کیا، بلکہ انھوں نے ضروری قرار دیا کہ یہ علوم وفنون ان کے قدیم فلسفہ اور ان کی تہذیب وتمدن کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، اور ان کے دل ودماغ کی گہرائیوں تک اترے ہوئے نظریات وافکار، اور ان کے رگ وریشہ میں سرایت کیے ہوئے عقائد سے ہم آہنگ ہوں، جن پر وہ قوی ایمان رکھتے ہیں اور ان پر مضبوطی سے قائم ہیں۔

آزادیِ فکر اور روسی نظریات

اسی طرح سوویت روس جس نے تمام ادیان و مذاہب کو کلی طور پر رد کر دیا ہے، اور آزادیِ فکر ورائے میں کافی آگے بڑھا ہوا ہے، جس کے بارے میں یہ مشہور ہوگیا ہے کہ ہر انسان کو اپنی پسند اور انتخاب کی آزادی دیتا ہے، وہ ہر قسم کے حدود اور پابندیوں سے آزاد ہو چکا ہے، اور کسی بھی فرد انسانی کی تقدیس کے نظریہ کا سرگرم مخالف ہے، خواہ وہ انبیاء ورسل ہوں یا روحانی پیشوا، یا فکری رہنما یا کسی خاص مکتب فکر کے داعی، اور وہ ہر قسم کی اجارہ داری کا منکر ہے، وہ ملک بھی تعلیم وتربیت کے اصول کو عالمگیر انسانی اصول اور نوع انسانی کا مشترک سرمایہ تسلیم نہیں کرتا، اور اس کو ایسا صاف شفاف پانی نہیں سمجھتا جس میں رنگ آمیزی نہ کی جا سکے، اور کمیونسٹ حلقہ کے باہر سے کسی طرز تعلیم کو درآمد کرنے؛ بلکہ ایسے علم وادب کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا، جو۔ بقول سوویت روس۔ بورژوائی اور سرمایہ دارانہ

ماحول ومعاشرہ میں پروان چڑھا ہو، جس کو سرمایہ داروں کے نظریات، رجحانات یا طرزِ تفکیر سے غذا ملتی ہو، وہ گھبراتا ہے کہ ایسے علوم وفنون کہیں کیمونزم کے عقیدہ میں شک وشبہ نہ پیدا کردیں اور اس کو کمزور نہ کردیں۔

سوویت روس جو تمام حدود وقیود اور ہر طرح کی تقدیس وتقلید کے خلاف بغاوت اور کامل آزادی کا علم بردار کہلاتا ہے، اس نے بھی نظریاتی اور عملی تمام علوم وآداب، یہاں تک کہ سائنس، جغرافیہ اور تاریخ تک کو کیمونزم کے اصولوں اور اپنے قائدین اور اپنی دعوت کے مؤسسین کارل مارکس، انجلز اور لینن کے افکار ونظریات کے تابع کردیا ہے، اور ان علوم و فنون اور ان رہنماؤں کی فکری بنیادوں میں باہم مضبوط اور مقدس تعلق قائم کردیا ہے، اور اس معاملہ میں وہ اسی طرح حساس اور زود رنج ہے جیسے پرانے مومنین اپنے عقائد اور اپنے مقدسات، یا پرانے عرب اپنے اہل وعیال اور اپنی عزت کے بارے میں بہت ہی حساس ہوتے تھے، اور اپنی جان قربان کردیا کرتے تھے، اور روسی بغیر کسی پس وپیش کے اور بلا جھجک اس کا اعلان بھی کرتے ہیں۔

سوویت روس کے ماہرین تعلیم میں سے صرف ایک کی شہادت یہاں کافی ہوگی، وہاں کا ایک ماہر طبعیات Mc Govern کہتا ہے:

> ''روسی علم عالمی علم کی قسموں میں سے کوئی قسم نہیں، بلکہ اس سے الگ اور مستقل بالذات علم ہے جو دوسری قسموں سے بہت مختلف ہے، کیونکہ سوویت علم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیادیں واضح اور ممتاز فلسفہ پر استوار ہیں، علمی تحقیقات کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہونی چاہیے، اور ہمارے علم کی بنیاد وہ مادی فلسفہ ہے جسے مارکس، انجلز، لینن اور اسٹالن نے پیش کیا، ہم چاہتے ہیں کہ طبعیاتی علوم کے میدان میں یہی فلسفہ لے کر داخل ہوں اور پوری قوت اور پامردی کے ساتھ ان تمام نظریات اور فلسفوں کا مقابلہ کریں جو ہمارے مادی، مارکسی فلسفہ سے ٹکراتے ہوں۔''

اسی بنا پر سوویت روس ضروری علوم اور اپنے تسلیم کردہ اصولوں میں تطبیق دینے میں کامیاب رہا، اوران کو باہم مربوط کرکے ایک مکمل اکائی بنادیا، اور اپنی طرز زندگی جس کے مطابق زندگی گزار رہا ہے، یا جس کی کوشش کررہا ہے، اوران اصول ومبادی کے درمیان جن پر کامل ایمان رکھتا ہے، پورے جوش وخروش کے ساتھ جس کی دعوت دیتا ہے اور جس کے لیے سخت لڑائیاں لڑ چکا ہے، کوئی خلا نہیں باقی رہنے دیا، اوراسی وجہ سے اس فکری اور نظریاتی اضطراب اور نفسیاتی خلجان سے محفوظ رہا جو دنیا کے بعض ایسے حصوں میں چھایا ہوا ہے جہاں متضاد اور متحارب ذہنیتیں اور طاقتیں انتشار پھیلا رہی ہیں، اور وہاں نفاق وشقاق کا دور دورہ ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام تعلیم

اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام زندگی اختیار کرنے والے ممالک اگرچہ مذہبی رواداری اور افکار وعقائد میں مطلق آزادی کے اصول کو اپنانے کی شہرت رکھتے ہیں، اور علم وسائنس کے میدان میں انسان کی عرق ریزی اور تجربات کے نتائج کو نوع انسانی کا مشترک اثاثہ سمجھتے ہیں اوران سے استفادہ کرنا جائز؛ بلکہ ضروری قرار دیتے ہیں، وہ بھی بیرونی افکار وخیالات اور ایسے نظام تعلیم کی اجازت نہیں دے سکتے جو اشتراکیت اور انتہا پسند کمیونزم کا بیج بوتا ہو، اور انفرادی ملکیت اور اشتراکی اصولوں کے علاوہ دوسری بنیادوں پر سرمایہ کاری اوراس کی تنظیم کا مذاق اڑاتا ہو، اسی طرح اس کی بھی اجازت نہیں دے سکتے بلکہ اس کا خیال بھی دل میں آنے نہیں دیتے کہ کم سے کم تعداد میں بھی کمیونسٹ ممالک سے اساتذہ بلائے جائیں، خواہ وہ علمی تفوق اورفنی مہارت میں کسی بھی درجہ کو پہنچے ہوئے ہوں۔

معاملہ یہیں تک نہیں؛ بلکہ مغربی ماہرین تعلیم وتربیت کسی ملک سے بھی نظام تعلیم کی درآمد درست نہیں سمجھتے، خواہ وہ عقیدہ اور بنیادی افکار ونظریات میں ایک دوسرے سے کتنے ہی قریب کیوں نہ ہوں اور حیات وکائنات اور انسان کے بارے میں ایک ہی نظریہ کیوں نہ رکھتے ہوں، چنانچہ تعلیم وتربیت کے اصول نہ تو انگلینڈ فرانس سے لینے پر تیار ہے، نہ فرانس انگلینڈ سے لینا چاہتا ہے، حالانکہ دونوں صلح وجنگ کے رفیق ودمساز ہیں، اور ازلی بغض، ضد

اور حسد رکھنے والے ملک جرمنی سے یہ نظام مستعار لینا تو دور کی بات ہے۔

انگریزی زبان، انگلوسکسن تہذیب وتمدن، متعدد سیاسی مصالح، دو عالمی جنگوں کی رفاقت، اور بڑی حد تک نسل وخون کی مشارکت نے برطانوی اور امریکی قوموں کو باہم دیگر بہت قریب کردیا ہے، دونوں ممالک میں پروٹسٹنٹ مذہب ہی کو غلبہ حاصل ہے، لیکن ان تمام تعلقات کے باوجود امریکہ میں تعلیم وتربیت کے نظریات اور پالیسیاں متعین کرنے والے نظام تعلیم برطانیہ سے مستعار لینا درست نہیں سمجھتے، ان کے خیال میں نظام تعلیم ایسی چیز ہے ہی نہیں کہ اس کو ضروریات زندگی، صنعتی مصنوعات یا خام مواد کی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں درآمد کیا جائے، امریکی فاضل Dr.J.B.Conant اپنی کتاب Education and Liberty (تعلیم اور آزادی) میں لکھتا ہے:

''تربیت کے اصول وضوابط، لین دین اور خرید وفروخت کی چیز نہیں، اور نہ کوئی ایسا سامان ہے جس کی درآمد برآمد کی جائے، ہم نے ماضی میں یورپی یا انگریزی تعلیمی نظریات کو امریکہ میں اختیار کرکے نفع سے زیادہ نقصان اٹھایا ہے۔''

اسلامی نظام تعلیم وتربیت

حضرات! ان ماہرین اور رہنماؤں کی نظر میں جو اپنی قومی خصوصیات اور اپنے ملک کے امتیازات کو اپنی جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں، تعلیم وتربیت کا نظام ایک ایسا لباس ہے جس کی قطع وبرید قوموں کے قد وقامت، قومی خصائص، آبائی رسوم، اور ان بلند اقدار اور مقاصد کے مطابق ہونی چاہیے جن کو یہ اپنی حیات وموت کا حاصل سمجھتی ہیں، ایسا لباس ہے جس میں ماحول، آب وہوا اور اس معاشرہ کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے جس میں قوم زندگی گزار رہی ہے، اس طرح ان کے اختیار کردہ اخلاق وعادات، ان کی تاریخ جس پر وہ فخر کرتی ہے، اور اس مثالی کردار سے مطابقت بھی ضروری ہے جس پر وہ فریفتہ ہے، اور جس کی مدح سرائی کرتی رہتی ہے۔

ہم مسلمانوں کے لیے تو اور زیادہ ضروری ہے کہ آخری نبی (ﷺ) کے لائے ہوئے عقائد اور اس دین کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھیں جو مسخ وتحریف کی دست درازیوں سے محفوظ رہا اور جس پر انقلابات زمانہ کبھی اثر انداز نہیں ہوئے، جبکہ دوسرے مذاہب تغیرات زمانہ کا اثر قبول کرتے رہے اور انسانی تجربات ان میں ترمیم و تنسیخ بھی کرتے رہے، اس کی شہادت خود ان مذاہب ہی کی تاریخ سے ملتی ہے کہ وہ ہمیشہ انقلاب و تغیر اور انسانی اسباب وعوامل کے تابع رہے، اور پھر ان مذاہب میں بنیادی عقائد اور دین و بے دینی، کفر و ایمان اور اخذ و ترک کے حدود کو وہ اہمیت اور فیصلہ کن حیثیت حاصل نہیں جو ہمارے مذہبی عقائد کو حاصل ہے، بلکہ ان مذاہب میں کفر وایمان کے مابین فرق وامتیاز کرنے والے حدود سرے سے ہیں ہی نہیں، جو ہمارے یہاں موجود ہیں، اور جن میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے ساتھ رعایت کی گنجائش ہے نہ کسی اہم ترین مصلحت کے پاس ولحاظ کی، دوسری قوموں میں عقائد اور مذہبی اقدار کہیں تو بہت زیادہ لچکدار بلکہ سیال ہیں، کہیں بہت ہی مبہم اور غیر واضح، اسلامی عقائد ہی کی طرح اسلام کا مرقع بھی صاف و بے داغ ہے، اور اسلامی سیرت و کردار واضح خد وخال اور متعین حدود رکھتا ہے۔

اور جزیرۃ العرب اسلامی عقائد اور اسلامی سیرت و کردار میں دوسرے اسلامی ممالک کا صرف سہیم وشریک ہی نہیں، بلکہ اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ اسی کے سر ہے، کیونکہ وہی اس کا اولیں داعی اور اس کا دائمی محافظ اور اسلامی دعوت کا منبع ومخرج اور ملجا وماویٰ ہے، رسول اللہ (ﷺ) کی صحیح حدیث ہے: (إنَّ الإيمانَ لَيَأْرِزُ إلَى المَدِينَةِ كَمَا تَأْرِزُ الحَيَّةُ إلَى جُحْرِهَا) [1] ''دین سمٹ سمٹا کر مدینہ ہی کی طرف آجائے گا جیسے سانپ اپنے سوراخ میں سمٹ سمٹا کر داخل ہو جاتا ہے۔''

اس لیے اسے دنیا کے کسی دوسرے ملک وقوم سے استفادہ کرنے کے بارے میں غیرت کا ثبوت دینا چاہیے، ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ تعلیم وتربیت، طرز تعلیم اور نصاب

(۱) رواه البخاري في صحيحه، كتاب فضائل المدينة، باب الإيمان يأرز إلى المدينة، حديث رقم ۱۸۷۶

درس کا لباس اپنے قد وقامت کی ناپ پر تیار کریں، اور کسی بھی قوم و جماعت کے مقابلہ میں اپنے اصول ونظریات ومقاصد کے بارے میں زیادہ غیور، زیادہ ذکی الحس اور زیادہ وفادار ثابت ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ [سورة آل عمران: ۱۱۰] ''تم بہترامت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم کرتے اور برائی سے روکتے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔''

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [سورة البقرة: ۱٤۳] ''اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل قوم بنایا تاکہ تم لوگوں کے درمیان گواہ عادل کی حیثیت سے رہو۔''

لہٰذا ہم کو چاہیے کہ علوم وفنون، نظامہائے تعلیم وتربیت کے نظریات —خواہ وہ مغرب کے ساختہ پرداختہ ہوں یا مشرق کے پروردہ— یہ سمجھ کر قبول نہ کریں کہ یہی انسانی علوم کا معراج اور منتہائے کمال ہے، اور اس کی تمام جزئیات وتفصیلات کے ساتھ اس کو قبول کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا تمام مشرقی اقوام پر فرض ہے، اور مقامی اثرات اور وقتی مصالح کے تقاضوں سے پاک کرنے کی بھی گنجائش نہیں، بلکہ انھیں یہ سمجھ کر قبول کرنا چاہیے —اگر قبول کرنا ضروری ہو— کہ یہ انسانی تجربات ہیں، جن میں خطا وصواب، کامیابی اور لغزش اور بصیرت و بے بصیرتی دونوں کا امکان ہے، ہمیں چاہیے کہ علوم وآداب اور مختلف زبانوں کو یہ سمجھ کر نہ اپنائیں کہ یہ اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں، اور ان پر ترقی وتکمیل کی ایسی مہر لگ چکی ہے جسے توڑا نہیں جا سکتا، بلکہ ہم ان علوم وفنون کو خام مواد کی طرح لیں اور اپنی ضرورت اور حالات کے مطابق جس شکل میں چاہیں ڈھال لیں، ان میں مخلوط فساد، الحاد اور اخلاقی اقدار کی تضحیک کرنے والے عناصر کو بلا کسی تکلف اور پس وپیش کے ان سے خارج کر کے ان کو صاف ستھرا اور پاکیزہ بنا دیں، بلکہ ان میں ایمان باللہ اور اس ایمان کی روشنی میں حیات وکائنات کے متعلق گہری بصیرت کا قیمتی اضافہ کر دیں، اس طرح تمام علوم وفنون کو بغیر کسی دقت اور پریشانی کے علم و

حکمت کا وسیلہ اور ایمان ومعرفت کا ذریعہ بنا کر اپنے آپ کو ارشاد خداوندی کا مصداق ثابت کریں: ﴿وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ [سورۃ آل عمران: ۱۹۱]، ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [سورۃ فاطر: ۲۸] یہ موجودہ عالم اسلام کا بہت ہی اہم تجربہ ہوگا، موجودہ عمومی حالات جس کا تقاضا کر رہے ہیں، عالم اسلام میں برسر اقتدار تعلیم یافتہ طبقہ اور صحیح العقیدہ جمہور مسلمانوں کے درمیان برپا کشمکش بھی اسی کی متقاضی ہے، اور یہ ملک اس تجربہ کی تخم ریزی کے لیے بہترین کشت زار ثابت ہوسکتا ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سازگار حالات اور مناسب مواقع بھی مہیا کر دیے، کیونکہ اس پر ایسی حکومت سایہ فگن ہے جو ایک دینی دعوت کے طفیل وجود میں آئی ہے، جو دین خالص اور کتاب وسنت کو تمام انفرادی واجتماعی معاملات میں جاری کرنے کی دعوت دیتی ہے، اور صرف اس انتساب کو اپنے لیے باعث صد افتخار سمجھتی ہے۔

عقلی نابالغی

دنیا کی وہ قومیں جو سن رشد کو پہنچ چکی ہیں، جن کا شعور پختہ ہو چکا ہے، اور جو غلامی اور اندھی تقلید کی زنجیروں سے آزاد ہو چکی ہیں، ان کی نظر میں تعلیم وتربیت اب اصل مقصد نہیں ہے، بلکہ ان کی حیثیت اب اصل تک پہنچنے کے وسیلہ کی ہوگئی ہے، دنیا عقلی نابالغی کے دور میں بہت سی چیزوں کو اصل مقصد سمجھتی رہی، لیکن طویل تجربات اور انسانی عقل کی ترقیوں کے بعد اب وہ چیزیں بلند مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دی جارہی ہیں، لہذا یہ کوئی انہونی بات نہیں کہ تعلیم وتربیت، مدرسوں، علم وفن کے مرکزوں، کتب خانوں اور نشر واشاعت کے اداروں کو کسی زمانہ میں اصل مقصد کی حیثیت دی گئی ہو۔

لیکن مشرق پر یہی نابالغ ذہنیت اب تک مسلط ہے، ہم قوم کی ایک قابل لحاظ تعداد کو لکھنا پڑھنا سکھا دیتے ہیں، کسی علاقہ میں چند مدرسے اور کالج قائم کر دیتے ہیں، تو ہم سمجھتے ہیں کہ گوہر مقصود حاصل کر لیا اور اپنے فرض سے سبک دوش ہوگئے۔

لیکن مغرب جو تعلیم کا بہت شائق ہے، اور اس آخری دور میں پوری دنیا میں اس کا جھنڈا لہرا رہا ہے، جس کے اکثر ممالک اور علاقے غیر جانبداری، لامذہبیت بلکہ الحاد و بے دینی تک میں شہرت رکھتے ہیں، وہ بھی تعلیم کے نظام اور تربیت کے اصولوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا بے جان آلہ نہیں سمجھتا، اور نہ اسے ایسے منتشر اور بے جوڑ معلومات کو ایک سے دوسرے تک منتقل کرنے کا وسیلہ قرار دیتا ہے، جن کو باہم مربوط کرنے والی کوئی وحدت اور ان سب کو ایک نقطہ پر جمع کرنے والا کوئی مقصد نہ ہو، ان پر ایمان وعقیدہ کی گہری چھاپ نہ ہو، اور وہ نئی نسل کو اپنے اسلاف سے جوڑنے کا ذریعہ نہ بن سکے، بلکہ وہ بھی نظام تعلیم کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کہ حاضر کو ماضی سے، نئی نسل کو اسلاف سے اور معلومات کو عقائد سے ملانے والا پل ہے، اور موروثی عقائد وخیالات کے لیے علم ومنطق اور دلیل و برہان کا مضبوط سہارا فراہم کرتا ہے، مغرب جس نظام تعلیم پر بے پناہ دولت صرف کر رہا ہے، اس کو وہ انتشار و تخریب کا نہیں بلکہ تشکیل وتعمیر کا عمل سمجھتا ہے، اور ذہنی وفکری خلجان واضطراب اور باہم متصل کڑیوں کو توڑنے کا نہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں باہمی تعلق وارتباط اور افراد میں باہمی اعتماد کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔

مغربی مفکرین وماہرین تعلیم کے رجحانات وافکار

یہاں موجودہ مغربی دنیا کے تین سر برآوردہ مفکرین اور ماہرین تعلیم کی رائیں نقل کی جارہی ہیں، سر پیری نن (Sir Bercy Linn) جو برطانیہ کے ماہرین تعلیم میں سب سے ممتاز مقام رکھتا ہے، ''انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا'' کے ایک مقالہ میں لکھتا ہے:

> ''لوگوں نے تربیت کی تعریف متعین کرنے میں مختلف راہیں اختیار کی ہیں، لیکن ان تمام میں مشترک اصل اور بنیادی نقطہ یہ ہے کہ تربیت قوم کے بزرگوں اور تربیت دینے والوں کی اس کوشش کا نام ہے جو نئی نسل کو اپنے تسلیم واختیار کردہ نظریۂ زندگی کے مطابق ڈھالنے کے

لیے کرتے ہیں، اور ایک مدرسہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ طالب علم میں نظریۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے روحانی عوامل کو اثر انداز ہونے کا موقع فراہم کرے، اور طالب علم کی ایسی تربیت کرے کہ اس کے لیے اپنے قومی زندگی کی حفاظت اور اس کو آگے بڑھانا ممکن ہو سکے۔"

جان ڈیوی (John Dewey) موجودہ امریکی نظام تعلیم میں دوسرے ماہرین سے کہیں زیادہ اثر انداز ہوا ہے، اپنی کتاب "جمہوریت اور تعلیم" (Democracy And Education) میں لکھتا ہے:

"قومیں تجدید کے سہارے زندہ رہتی ہیں، اور تجدیدی کوششوں کی بنیاد بچوں کی تعلیم پر قائم کی جاتی ہے، قوم مختلف طریقوں سے ناخواندہ افراد میں سے اپنے وسائل اور اپنے نظریۂ زندگی کے لیے صالح ورثاء مہیا کرتی ہے، اور ان کو اپنے عقائد اور اصولوں کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔"

پروفیسر کلارک (Prof. Clark) کہتا ہے:

"تربیت کی تعریف وتشریح میں جو کچھ بھی کہا جائے، لیکن جس سے مفر نہیں، یہ ہے کہ یہ اس نظریۂ زندگی کی حفاظت، اس کو مستحکم کرنے اور اگلی نسلوں تک پہنچانے کی جدوجہد کا نام ہے جس پر قوم پہلے سے ایمان لا چکی ہے، اور جس کی بنیادوں پر قومی زندگی کی عمارت قائم ہے۔"

اسی نقطہ پر اسرائیل بھی سب سے زیادہ زور دیتا ہے، چنانچہ وہ اپنے تمام ترقی پسند رجحانات، ترقی یافتہ یورپی ممالک کے ساتھ ساتھ چلنے کی خواہش اور غیر ملکی زبانوں اور جدید علوم کے ماہرین کی بڑی تعداد رکھنے کے باوجود اپنے مذہبی شعور اور ثقافتی سرمایہ رکھنے والی عبرانی کو آگے بڑھانے میں تمام ممالک سے آگے ہے، ڈاکٹر راڈرک ماتھیوز (Dr. Roderick Matheios) اور ڈاکٹر متی عقراوی کی مرتب کردہ کتاب "التـــربية فـــي

الشرق العربي" میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے:

"فلسطین کے اسرائیلی مدارس میں سب سے اہم اور قابل توجہ چیز یہ ہے کہ انگریزی، فرانسیسی اور عربی زبانوں کی تعلیم کے علاوہ تمام مضامین میں ذریعہ تعلیم عبرانی ہے، اور تعلیم کے تمام مراحل میں مذہبی تعلیم اور اس کو صہیونیت کی بقا وترقی کی بنیاد بنانے پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔"

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل کے تمام مدارس اور تمام پارٹیاں اور طبقے جن سے طلبہ کے سرپرست تعلق رکھتے ہیں، تعلیمی، مذہبی اور سیاسی خیالات اور قدروں میں باہمی اختلافات کے باوجود اس بنیادی نقطہ پر سب متفق ہیں، اور مذہبی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں، بعضوں کا خیال ہے کہ یہود کی مذہبی روایتیں ہی روشنی کا مینار ہیں، جن سے نظام تعلیم کے لیے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔

ماہنامہ "فلسطین" میں "اسرائیل میں اعلیٰ تعلیم" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے، اس کا مقالہ نگار (دائرة البحوث و الدراسات في الهيئة العربية العليا لفلسطين) فلسطین کے اعلیٰ عربی ادارے کے شعبۂ تحقیق ومطالعہ کی تحقیقاتی رپورٹ کے حوالہ سے لکھتا ہے:

"اعلیٰ تعلیم میں جو سیاست کارفرما ہے، اس کا اصل مقصد ہے: یہودی عقیدہ کی ترویج واشاعت، اور اس کے ساتھ محبت وتعلق میں اضافہ، ساتھ ہی اسرائیل کے لیے پروپیگنڈا اور اس کے لیے دوستوں کی تلاش۔!!"

اس مقالہ میں عبرانی زبان اور اس کی یونیورسٹیوں کی طرف غیر معمولی توجہ، ان کے بجٹ اور ان کے لیے یہود کی مساعی، ان پر خرچ ہونے والی بے حساب دولت اور ان کے لیے بہترین انتظامات کی حیرت انگیز تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔

اس فکر و خیال کی اصل بنیاد- جو تعلیم و تربیت کو قوم کے قبول کردہ عقائد، خیالات اور اقدار کو مضبوط کرنے اور ان کو اجاگر کرنے کا وسیلہ قرار دیتا ہے- یہ ہے کہ اصل معیار اور قابل لحاظ چیز ہے: والدین کا عقیدہ اور ان کا ارادہ، انہی کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ اپنے جگر گوشے، اپنے خوابوں اور خیالوں کے وارث اپنے بچے کے لیے نظام تعلیم منتخب کریں۔

بمبئی کی مسیحی تعلیمی اداروں کی انجمن نے بمبئی کی صوبائی حکومت کے خلاف وہاں کے ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا تھا، اور ہائی کورٹ سے درخواست کی تھی کہ صوبائی حکومت کو مسیحی لڑکوں کو ان کے والدین کی مرضی کے خلاف تعلیم دینے سے باز رکھے، اس درخواست پر وہاں کے چیف جج اور ایک دوسرے جج نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''جمہوریت میں ایک شہری کا سب سے قیمتی حق فکر و خیال کی آزادی ہے، اور اس میں اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ خیال پر کنٹرول کرنے کا سیدھا اور آسان طریقہ نوجوانوں کی تعلیم کو کنٹرول کرنا ہے، حکومت کسی باپ کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے بچے کو وہی تعلیم دلائے جسے حکومت مناسب سمجھتی ہو، انسانی حقوق کے چارٹر- جس میں ہندوستان بھی شریک ہے- کے آرٹکل ۶ (۳) میں کہا گیا ہے کہ ''والدین کو پہلا حق ہے کہ وہ اس کا انتخاب کریں کہ ان کے بچے کو کس قسم کی تعلیم دی جائے۔''(۱)

یہ مغربی اقوام، مسیحی عقائد سے جن کا تعلق بہت کمزور ہو گیا ہے، مسیح علیہ السلام کے دیے ہوئے اخلاقی اقدار کی جن کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رہی، جن میں مسلم اصولوں او رحقائق کے بارے میں بے اعتمادی پھیل گئی ہے، جب یہ قومیں اپنے نظام تعلیم کو اس خاص نقطۂ نظر سے دیکھتی ہیں، اور اس سے زندگی اصول و عقائد میں استحکام پیدا کرنے اور فرد و جماعت، عقل اور جذبات اور حاضر اور ماضی کے درمیان ربط و تعلق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا

(۱) All India Reporter 1954, S.C. 561

کام لیتی ہیں، تو پھر مسلم اقوام اور اسلامی اور عرب ممالک اس سے یہ کام کیوں نہ لیں جبکہ ان کی پوری تاریخ میں کبھی علم وکلیسا اور مذہب وحکومت کے درمیان نام نہاد کشمکش بھی پیدا نہیں ہوئی، جہاں دین وسیاست میں فرق وامتیاز کا وجود ہی نہیں، جن کے نزدیک دین ومذہب افراد کی ذاتی زندگی تک محدود نہیں، اور جو تاریخ کے کسی دور میں بھی انتہا پسندانہ الحاد اور عمومی ارتداد کا شکار نہیں ہوئے۔

تعلیم فی نفسہ مقصد نہیں

ماضی قریب کی دو تباہ کن جنگیں۔جن کی قیادت علم اور تہذیب وتمدن کے چوٹی کے لوگوں نے کی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ترقی یافتہ تعلیم صالح اخلاق، انسانیت کا احترام اور کمزور اقوام کے ساتھ عدل کا جذبہ پیدا کرنے میں قطعی ناکام رہی، امریکہ، یورپ، ہندوستان اور دوسرے متعدد مشرقی ممالک میں یونیورسٹیوں کے نوجوانوں کا اخلاقی بگاڑ، طلبہ کی قانون اور نظم وانصرام میں دست درازیاں اور طفلانہ خواہشات اور پست اغراض کی پیروی، یہ سب صاف بتارہے ہیں کہ تعلیم فی نفسہ مقصد نہیں بلکہ وہ صرف ایک ذریعہ ہے، جو کامیاب بھی ہوسکتا ہے، ناکام بھی، نفع بخش بھی ثابت ہوسکتا ہے مضرت رساں بھی، اور تعمیر کا سامان بھی بن سکتا ہے اور تخریب کا ذریعہ بھی، اور جب وہ اخلاق کی عفت، صالح ذہنیت، صحیح عقیدہ اور مذہبی رجحان جیسے عناصر سے خالی ہوگا تو نقصان کا پہلو نفع سے کہیں زیادہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین اور ماہرین تعلیم کی نظر میں بھی تعلیم وتربیت یا لکھنا پڑھنا سکھانے کی فی نفسہ کوئی قیمت نہیں رہی، بلکہ اس کی قیمت کا اندازہ اس کے نتائج، تعلیم یافتہ افراد کے اخلاق اور معاشرہ کی تعمیر وترقی میں ان کے کردار کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

سطحی انداز فکر

ہمارے مشرقی ممالک میں تعلیم یا صحیح تر الفاظ میں لکھنے پڑھنے کی عظمت واہمیت جتانے کے لیے کیے گئے زبردست پروپیگنڈا، اس میں مبالغہ اور حد سے تجاوز، اعلیٰ تعلیم وثقافت کی

قدر و قیمت میں شاعرانہ خیال آرائی، اور جہالت کی مکروہ تصویر کشی اور جامعی تعلیم سے محروم افراد کی تحقیر و تضحیک، ان تمام اسباب و عوامل نے اعلیٰ تعلیم و ثقافت کو ایک طرح کا تقدس عطا کر دیا، جس کی وجہ سے لوگ بہت سے حقائق اور تعلیم یافتہ طبقہ کے عیوب کو نظر انداز کر جاتے ہیں، اور اکثر فریب خوردہ ذہن کے لوگ، شریف اور نیک جاہل پر، تعلیم یافتہ پست اخلاق مجرم کو ترجیح دیتے ہیں، اسی طرح اس ذہنیت والوں کے خیال میں اس زمانہ کے مقابلہ میں، جبکہ تمام دینی واخلاقی فضائل ومحاسن بکثرت پائے جاتے تھے، لیکن تعلیم یافتہ افراد کا تناسب کم تھا اور لکھنے پڑھنے کا رواج بھی زیادہ نہیں تھا، یہ زمانہ زیادہ ترقی یافتہ اور افضل ہے جس میں پڑھنے لکھنے کا رواج تو بہت ہو گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اخلاقی زوال، ذہنی انتشار اور اصول و مسلمات اور حقائق و بدیہیات میں شک اور بے اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا ہے، جس کے پنجہ میں گرفتار ہو کر لوگ اپنے آپ اور اپنی اولاد تک سے غافل ہو گئے ہیں، دینی واخلاقی غیرت مفقود ہو گئی، اور مادہ انسانوں کا معبود بن گیا، یہ ذہن تعلیم اور ڈگریوں کی عظمت و اہمیت جتانے والے سطحی پروپیگنڈا کے سامنے عبرتناک شکست کا نتیجہ ہے، یہ بہت سطحی انداز فکر ہے، ذریعہ و مقصد میں فرق کرنے والے اور اخلاق اور اعمال صالحہ کی قدر و قیمت سمجھے والے افراد کے فکر و نظر کو اس سے بلند ہونا چاہیے۔

ایک حقیقت

تاریخ بار بار یہ ثابت کر چکی ہے کہ جو قومیں ذرائع کو مقاصد کا درجہ دیتی ہیں، علوم وفنون کو قابل پرستش معبودوں کے مقام پر فائز کرتی ہیں، جن میں اخلاق و اعمال کے مقابلہ میں بحث ونظر کا رجحان بڑھ جاتا ہے، جمالیات سے دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے، قوت ارادی کمزور پڑ جاتی ہے، غیرت وحمیت کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے، اور اس کے عقائد میں شکوک پیدا ہو جاتے ہیں، قدیم روایات کا مذاق اڑایا جاتا ہے، اور شکوک کا دائرہ مذہبی مآخذ، تاریخی مراجع، تاریخی شخصیات و واقعات اور رسوم و روایات تک بڑھ جاتا ہے، اور اس کی قیادت بڑے بڑے محققین، ماہر ادباء اور انشاء پرداز اور صحافی کرنے لگتے ہیں، اور یہ زہر قوم کے ہر

طبقہ میں پھیل جاتا ہے، اورنوجوانوں کی عقل وضمیر میں سرایت کرجاتا ہے، تو یہ قوم کسی بھی مخالف طاقت اور حملہ آور دشمن کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتی، اور کسی معرکہ میں ایک دن بھی نہیں جم سکتی، یونانیوں اور رومیوں کی تاریخ سے یہی سبق ملتا ہے، اور مشرقی عرب کا المیہ بھی کوئی زیادہ دن کی بات نہیں۔

ہم کیا کریں؟

ہم کو چاہیے کہ ہم حقیقت پسندی کا ثبوت دیں اور اعلی تعلیم اور مغربی تہذیب کے بارے میں حقائق اور تجربات کی روشنی میں صحیح رائے قائم کریں، اسی کو تمام امراض کا واحد علاج نہ سمجھیں، اس کو کبریائی اور تقدس کا مقام نہ عطا کریں، بلکہ اس میں ایسے عناصر کا اضافہ کریں جواس سے بگاڑ، الحاد اور اباحیت کے عوامل کا اثر زائل کردے، اوراس کو اپنی ثقافت، اسلامی کردار اور مشرقیت کے عناصر سے ہم آہنگ کرلیں، اور اپنے عالمی ابدی پیغام کے تابع بلکہ اس کا پاسبان بنالیں۔

ہمیں تعلیم وتربیت، تہذیبی منصوبہ بندی اور ہر پروگرام سازی کے وقت اس کا پورا شعور واحساس ہونا چاہیے کہ موجودہ جزیرۃ العرب محمد رسول اللہ (ﷺ) کا لگایا ہوا نہال سدا بہاراوران کی اوران کی اصحاب اوران کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی دعوت و جہاد ہی کا ثمرۂ طیب ہے، اسی لیے اس پرانھیں کا حق ہے، اس لیے اس جزیرہ میں طے کیے جانے والے نظم و نسق، منصوبہ بندی اور یہاں قائم ہونے والے اداروں کواسی اصول کا تابع اوراسی روح کا حامل ہونا چاہیے، رسول اللہ (ﷺ) اس کے شدت سے خواہاں اوراس کی اہمیت کومحسوس فرماتے تھے کہ یہ جزیرہ اسلام کا ناقابل تسخیر قلعہ بنا رہے، اوراپنے اصول پر مستحکم ہونے کے سبب ہر قسم کی دینی کشمکش اورفکری انتشار سے بچا رہے، چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''میں نے رسول اللہ (ﷺ) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: (لأخرجن اليهود و النصارى من جزيرة العرب حتى لا أدع إلا مسلما) (۱)

(۱) رواه الإمام أحمد في مسنده، حديث رقم ۲۰۱

''میں جزیرۃ العرب سے یہود اور نصاریٰ کو نکال دوں گا، اور مسلمانوں کے سوا اس میں کسی اور کو نہ رہنے دوں گا۔'' اسی طرح آپ (ﷺ) نے امت کو یہ تاکید فرمائی کہ (لا یجتمع دینان في جزیرۃ العرب)[1] ''جزیرۃ العرب میں دو دین نہ رہیں۔''

رسول اللہ (ﷺ) کی یہ حکیمانہ وصیت اور مصلحت آمیز تعلیم میں ان تمام عناصر سے جزیرۂ عرب کو پاک رکھنا شامل ہے جو اسلام کے اس قلعہ میں بغاوت، ارتداد اور اسلام کی فضیلت، اس کے پیغام کی ابدیت اور عمومیت پر ایمان نہ رکھتے ہوں، اور فلاح و کامرانی کو اسی کے مطابق ایمان و عمل میں منحصر نہ سمجھتے ہوں۔

یہ حکیمانہ وصیت اور دوررس اقدامات ہر اس چیز کو اس جزیرہ سے دور رکھنے پر مشتمل ہے جو اسلام کے اس قلعہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار الحکومت میں ردّت و بغاوت، اسلام کے بارے میں بے اعتمادی، اس کے پیغام کی ابدیت و عالم گیری سے مایوسی اور اس سے انکار کا رجحان پیدا کرے۔

قبول دین کے معاملہ میں کوئی جبر و کراہ نہیں، اور اسلام کی تاریخ ان ''تحقیقاتی و احتسابی عدالتوں'' (محاکم التفتیش Courts of Inquisition) کے طریقوں سے آشنا نہیں، جن جن کے لیے قرون مظلمہ (Dark Ages) کا یورپ مشہور و بدنام ہے، لیکن اس کے باوجود اس جزیرہ میں- جسے اسلام کے اصل مرکز اور قلب کی حیثیت حاصل ہے- انارکی، انتشار، لاقانونیت، تشکیک، ضعیف الاعتقادی اور اسلامی عقائد و اصول سے بداعتمادی پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اور اسلام کی راجدھانی اور اسلامی دعوت کے گہوارہ اور اسلام کی فوجی چھاونی میں رہ کر کسی کو مخالف طاقتوں اور اجنبی قوتوں کا گمراہ کن پروپیگنڈہ کرنے اور ان کا ایجنٹ اور آلہ کار بننے کی آزادی نہیں بخشی جا سکتی، اس لیے اسلام کی ابدی صداقت اور حضرت محمد رسول اللہ (ﷺ) کی نبوت و رسالت، آپ کی عالمگیر اور ابدی امامت و قیادت کے بارے میں جو شرح صدر نہیں رکھتا اور وہ غیر اسلامی فلسفوں اور نظریوں

(۱) رواه الإمام مالك في الموطا عن ابن شهاب مرسلاً، كتاب الجامع، باب ما جاء في إجلاء اليهود من المدينة، حديث رقم ١٥٩٠

پر عقیدہ اور ان کے لیے حمیت رکھتا ہے، تو اس کے لیے فی الحقیقت اس جزیرہ میں کوئی جگہ نہیں، اور نہ یہ جائز ہے کہ اس کو اپنے خیالات کی تبلیغ کے مواقع فراہم کیے جائیں، اور نئی نسلوں کے ذہن وفکر کی تربیت ورہنمائی کا کام سپرد کیا جائے، اور یہ کسی طرح درست نہیں کہ اس جزیرہ کے لخت جگر اور نور نظر نوجوانوں کو ایسے شخص کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ ان کو ان سانچوں میں ڈھالے جو اس جزیرہ کے بنیادی عقیدہ ودعوت سے مختلف ہوں جس کے لیے یہ جزیرہ ہزار سال سے زائد سینہ سپر رہا ہے، اور جس کے سبب عالم اسلام ہر دور میں اس کا کلمہ پڑھتا اور اس کی عقیدت ومحبت کا دم بھرتا رہا ہے، خدا کی زمین بہت وسیع ہے، ایسے شخص کو دنیا میں کہیں اور اپنی جگہ تلاش کرنی چاہیے، سرزمین عرب میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ (۱)

(۱) ریاض یونیورسٹی (سعودی عرب) میں ۱۳ر نومبر ۱۹۶۸ء کو کی گئی تقریر، ترجمہ بقلم: مولانا نور عظیم ندویؒ، ماخوذ از ہفت روزہ ''ندائے ملت''، (لکھنؤ) خصوصی اشاعت ''تعلیم نمبر''۔

نظام تعلیم میں نظر ثانی کی ضرورت

تعلیم کے مسئلہ پر اظہار خیال کے لیے وسیع تجربہ رکھنے والے جمع ہیں، اس وقت کے حاضرین کی ادنی تحقیر یا حق تلفی کے بغیر میں اپنی طرف سے نہیں، بلکہ اس مسئلہ کی طرف سے یہ شکایت کرتا ہوں، اپنے دوستوں کی شکایت کرتا ہوں اور اپنی بھی شکایت کرتا ہوں، اس کو قبول کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ اس سے زیادہ وقت کا طالب تھا، اور اس سے زیادہ اطمینان اور سکون کی فضا کا متقاضی تھا۔

تعلیم کا مسئلہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے

تعلیم کا مسئلہ اپنے اندر پہاڑی دریاؤں اور آبشاروں جیسا شور نہیں رکھتا، اس کے لیے وقت اور مقالات و تقاریر کی پیمائش کے لیے کوئی فیتہ مناسب نہیں ہے جس سے اس کو ناپا جائے اور مقرروں کو اس کا پابند بنایا جائے، اس کے لیے تو ایک علمی مذاکرہ یا خاص قسم کا سیمینار یا سمپوزیم مناسب تھا، آپ حضرات اس کانفرنس کی نشستوں اور مختلف جلسوں میں شرکت کر کے تھک گئے ہیں، اس کے لیے یہ وقت بھی مناسب نہیں ہے، اس صورت میں تعلیم جیسے سنجیدہ اور غور طلب مسئلہ پر غور کرنے کے لیے وہ مناسب ماحول اور پر سکون فضا میسر نہیں ہے جو اس کا حق ہے۔

نظام تعلیم کی ثنویت

میرے محترم دوست یونس سلیم صاحب نے ایک ایسا مسئلہ اٹھایا ہے جو بڑا اہم ہے، وہ نیا تو نہیں ہے، لیکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے تازہ ضرور ہے، اور غور طلب ہے، وہ ہمارے نظام تعلیم کی

دوئی یا ثنویت ہے؛ یعنی دو متوازی نظام تعلیم کا کسی ملک یا معاشرہ میں نافذ ہونا، اس معاشرہ کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے، اور یہ اس کو بہت غیر ضروری مشکلات میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی ہے، اس مسئلہ پر ہندوستان کے اہل فکر نے، اور ہندوستان کے باہر مشرق وسطی کے مفکرین نے اظہار خیال کیا ہے، میری ناچیز تصنیفات میں بھی اس پر اظہار خیال موجود ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستان میں سب سے پہلے مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی نے اس مسئلہ پر اظہار خیال فرمایا، ۱۹۵۱ء میں جب مجھے مصر جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے ایک عرب فاضل اور بڑے تجربہ کار معلم ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے پہلی مجلس اور پہلی ملاقات میں اس پر گفتگو کی، حقیقتاً یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر بہت اطمینان کے ساتھ تبادلۂ خیال ہونا چاہیے، میں یونس سلیم صاحب کی معلومات میں اضافہ کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا، لیکن شاید اپنے بہت سے سامعین اور حاضرین کی معلومات میں اضافہ کر سکوں کہ ہمارا قدیم نصاب تعلیم اس عیب سے بری تھا۔

درس نظامی

آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں جو نظام تعلیم کئی صدی تک چلا اور جس کو آخری دور میں درس نظامی سے موسوم کیا جانے لگا، اس کو ترکستان و ایران میں بھی قبول کیا گیا، اس میں بھی کسی قسم کی تقسیم نہیں تھی، وہ نظام تعلیم یہاں ہر قسم کی ضرورت کے اشخاص پیدا کرنے کا ذمہ دار تھا، یعنی وہ جہاں علماء وفقہاء اور مفتی پیدا کرتا تھا، اور اس وقت کی سلطنت کو قاضی اور ماہرین فقہ مہیا کرتا تھا، وہاں ایڈمنسٹریشن اور سول سروس کے ماہرین بھی تیار کرتا تھا، اس نظام تعلیم کے علاوہ کوئی دوسرا نظام تعلیم اس ملک میں موجود نہیں تھا جو خاص قسم کے اشخاص پیدا کرے، ان تمام تمدنی، تعلیمی، اخلاقی اور اجتماعی ضروریات کے لیے ایک ہی نظام تعلیم پر انحصار تھا، لیکن یہ صورت حال انگریزوں کے داخلہ کے بعد قائم نہیں رہی، اور ظاہر ہے کہ وہ اس نظام تعلیم کو قبول نہیں کر سکتے تھے، وہ ایک نیا نظام تعلیم اس ملک کے لیے لائے، اور اب تقریباً دنیا کے تمام ممالک میں دو متوازی نظام تعلیم جاری ہیں، یہ ذہنی انتشار اور جو کشمکش آپ کو معاشرہ میں نظر آتی ہے، جس کے مظاہر ہم کو زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتے

ہیں، یہ اس دوئی اور اسی دو متوازی نظام تعلیم کا نتیجہ ہیں۔

ساری دنیا کا نظام تعلیم اصلاح طلب ہے

ہمارے دوست یونس سلیم صاحب نے ہمارے دینی نظام تعلیم پر ہمدردانہ لیکن ناقدانہ -جس کا ان کو ہر وقت حق حاصل ہے- اظہار خیال فرمایا، میں اس پوزیشن کو ہرگز گوارا نہیں کروں گا اور نہ اپنے لیے مناسب سمجھتا ہوں اور نہ ان کے لیے کہ میں کوئی دفاعی موقف اختیار کروں، یا ان کے اٹھائے ہوئے بعض سوالات کا جواب دوں، لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ جہاں تک نظام تعلیم کا تعلق ہے، تقریباً ساری دنیا کا نظام تعلیم اصلاح طلب ہے، وہ بڑی حد تک اپنی افادیت کھو چکا ہے۔

آپ امریکہ و یورپ اور دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں دیکھیں گے، نہ صرف نظام تعلیم سے بلکہ نظام تعلیم کے بنیادی تخیل سے عام بے چینی پائی جاتی ہے، اور یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ یہ نظام تعلیم اب بہت کچھ فرسودہ اور Out of Date ہو چکا ہے، ان میں ہمیں نئی روح ڈالنی چاہیے، اور از سر نو اس کی تشکیل ہونی چاہیے، لیکن ابھی تک دنیا کے کسی حصہ میں بھی کوئی ایسا انقلابی اور جرأت مندانہ قدم نہیں اٹھایا گیا، اور یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو بغیر سوچے سمجھے رواں دواں ہے۔

معاشیات وسیاسیات کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ

اس عہد میں معاشیات اور سیاسیات نے اتنی اہمیت اختیار کر لی ہے اور وہ فکری قوی اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اس طرح حاوی ہو چکے ہیں کہ تعلیم کا مسئلہ جس توجہ کا مستحق تھا، اتنی توجہ اس پر نہیں کی گئی۔

علامہ اقبالؔ کا نظریہ

جہاں تک تقلید اور فرسودگی و کہنگی کا تعلق ہے، اور جہاں تک اصلاح طلب ہونے

کا سوال ہے، اس میں جدید اور قدیم نظام تعلیم کا کوئی فرق نہیں ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبالؔ مرحوم نے اپنا جب یہ مصرع کہا تھا:

کند مکتب رہ طے کردہ را طے

تو اس سے مراد کوئی قرآنی مکتب نہیں تھا جو مسجد میں کام کرتا ہے، بلکہ آپ کو معلوم ہے کہ ان کی اصطلاح ''دانش گاہ'' کے لیے مکتب اور مدرسہ کی ہے، وہ جب مکتب کا لفظ بولتے ہیں تو ان کی مراد دانش گاہ ہوتی ہے، تعلیم دینے کا مرکز، خواہ وہ کوئی یونیورسٹی اور کالج ہو، یا عربی کا مدرسہ اور دارالعلوم۔

اقبالؔ نے آج سے نصف صدی پہلے جو بات بہت سادے الفاظ میں کہی تھی:

ع کند مکتب رہ طے کردہ را طے

مکتب سے جو سبق روز اول سے پڑھا تھا ابھی تک وہ اس کو دہرائے چلا جا رہا ہے، جو راستہ طے ہو چکا ہے وہ اس کو طے کر رہا ہے، یہ صورت حال کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

اقبالؔ کے الفاظ میں ایک شکوہ

جہاں تک نظام تعلیم کا تعلق ہے وہ ایسے Radical Change، ایسے بنیادی انقلاب اور ایک ایسے جرأت مندانہ اقدام کا طالب ہے جس کے اندر جرأت بھی ہو، ذہانت بھی ہو، وسعت بھی ہو، میں اقبال کے الفاظ میں شکوہ کروں گا اور کم سے کم جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، یہ عرض کروں گا:

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے ۔۔۔ نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں ۔۔۔ ہائے محکومی و تقلید و زوال تحقیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب ۔۔۔ کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

تو واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جہاں تک عربی مدارس کا تعلق ہے، میں اس کا ایک حقیر خادم ہوں، مجھے یونس سلیم صاحب کے گلہ کا کوئی گلہ نہیں، میں ان کے ان تعلقات سے واقف ہوں جو نہ صرف مدارس سے؛ بلکہ ان کے خادموں سے ہیں، اور آج کے نہیں، بہت دیرینہ ہیں، میں

ان کے اس گلہ کو قبول کرتا ہوں کہ ان مدارس میں تبدیلی کی ضرورت ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ پورا نظام تعلیم از سر نو بدلنے کے قابل ہے، اور کوئی شخص جس کی زندگی پر نظر ہے، زندگی کے بدلتے ہوئے وسائل اور اس کی تیز رفتاری پر نظر ہے، وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ جس طرح سے قدیم مدارس زندگی سے الگ ہو گئے ہیں، وہ زندگی سے کچھ زیادہ ہم آہنگ نہیں ہیں، اسی طرح ان یونیورسٹیوں کے گریجویٹ اور فضلاء زندگی میں اپنا وہ مقام معین نہیں کرا سکے اور اپنی افادیت کا ایسا ثبوت نہیں دے سکے جتنا ثبوت انھیں دینا چاہیے۔

اسلامیات پر مزید توجہ کی ضرورت

جہاں تک تعلق ہے اسلامیات پر کام کرنے کا، میں یہ عرض کروں گا کہ اس وقت تک اس پر بہت کچھ کام ہو چکا ہے، بے شک مسئلہ کی نوعیت ایسی ہے کہ کسی کام کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا، یہ زندگی کی تعریف ہے، کوئی برائی یا عیب نہیں، اسی سے زندگی زندگی کہلانے کی مستحق ہے، کہ وہ کسی جگہ ٹھہرتی نہیں، وسائل اور اس کے مطالبات بدلتے رہتے ہیں، ان کے جواب دینے کی ضرورت ہے، میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ انھوں نے صورت حال کی جو تصویر پیش کی ہے، اس میں حقیقت کم ہے، اور شاید وہ ان کام کرنے والوں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکے، ایسا نہیں ہے، ان مسائل پر بہت وقیع لٹریچر پیدا ہو گیا ہے، لیکن ان کی اشاعت اور پبلسٹی کا کام جس پیمانہ پر ہونا چاہیے، اس میں ضرور کمی ہے۔

ہمارے علماء کے متعلق آج سے پچاس برس پہلے جو الفاظ کہے گئے تھے، بعینہ آج بھی دہرا دیے جاتے ہیں، دو دن سے سن رہا ہوں اور میرے کان میں جو الفاظ پڑے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں نے اپنے حافظہ پر زیادہ اعتماد کیا ہے، اور ذہن پر کم، مجھے افسوس ہے کہ ہمارے بہت سے احباب پوری صورت حال سے واقف نہیں ہیں، وہ نہیں جانتے کہ کن کن گوشوں میں کیسی کیسی کوششیں کی جا رہی ہیں، جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، ان کی تردید یا ان کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں بہت فکر انگیز لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، اس کا جائزہ لینا بھی بڑا اہم کام ہے، جو ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ ان

چیزوں کو بالکل اچھوت چھوڑ دیا گیا ہو اور ان کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی، کہ ندوۃ العلماء بے شک اپنے مقاصد میں اس حد تک کامیاب نہیں ہو سکا جس حد تک اس کے روشن ضمیر بانیوں نے سوچا تھا، اس کے بہت سے تاریخی، اقتصادی اور سیاسی اسباب ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ اس نے یہ آواز بلند کی تھی، وہ آواز اب بھی بڑا وزن رکھتی ہے، اور باوجود اس کے کہ اس پر ستر برس گزر چکے ہیں، اس میں کہنگی اور فرسودگی پیدا نہیں ہوئی، یہ ایک داستان ہے جو کبھی فرصت سے سنائی جائے گی۔

نظام تعلیم کے لیے ایک نئے اجتہاد کی ضرورت ہے

میں یہ عرض کروں گا کہ نظام تعلیم کے لیے ایک نئے اجتہاد کی ضرورت ہے، اور اس اجتہاد کا دامن صرف دینی مدارس تک محدود نہیں رہنا چاہیے، بلکہ پورے نظام تعلیم کو اس کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینا چاہیے، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ انسانوں کے لیے جو چیز پیدا کی جائے وہ کسی زمانہ میں بھی حرف آخر نہیں ہو سکتی، یہ صرف وحی الٰہی کی خصوصیت ہے، باقی یہ مشرق کی خصوصیت ہے نہ مغرب کی، اور قدیم وجدید کی تقسیم میں اقبال کے الفاظ میں دلیل کم نظری ہے، اس میں مشرق ومغرب کی کوئی تخصیص نہیں، اسلام ایک ابدی پیغام ہے، اس کا زندگی سے تعلق ہے، اور جس چیز کا زندگی سے تعلق ہو اس کو زندگی کا ہر وقت جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور تعلیم کے پورے مسئلہ کو اپنی نگرانی اور احتساب میں لینا چاہیے، اور اس میں کسی کی رعایت نہ کرنی چاہیے۔

فن تعلیم اور نظام تعلیم کے اصول

جہاں تک فن تعلیم اور اس کے اصولوں کا تعلق ہے، میں ان محنتوں کی قدر کرتا ہوں جو تعلیم کے اصول اور نظام تعلیم کے آداب اور تجربات کے بارے میں کی گئی ہیں، جو کتب خانہ اصول تعلیم پر اس وقت تک تیار ہو گیا ہے، وہ ہمارے قدر واعتراف کا مستحق ہے، لیکن فن تعلیم وہ مبحث وموضوع ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا، اس میں پرانے تجربات اور رہنما اصولوں سے

زیادہ عقل سلیم (Common Sense) اور اس مسئلہ سے مناسبت کی ضرورت ہے۔
اگر کسی جگہ تمام ماہرین تعلیم جمع ہو جائیں اور انھیں اس موضوع پر اظہار خیال کا موقع دیا جائے، تب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اس مسئلہ کا احاطہ کر لیا ہے، اس کو تو بہر حال ہمیں معلمین اور اساتذہ کے ذوق سلیم، اپنے موضوع سے محبت اور شیفتگی پر اور نوجوانوں کی نفسیات شناسی پر چھوڑنا پڑے گا، اور اسی پر اعتماد کرنا پڑے گا، یہ تعلیم کس طرح ہو؟ کس طرح اپنے موضوع کی محبت پیدا کر دی جائے؟ جس مذہب کی تعلیم دی جا رہی ہے، اس مذہب سے کس طرح وابستگی پیدا کی جائے؟ اور ان کے اندر کس طرح اس مذہب پر اعتقاد راسخ کیا جائے؟ کس طرح ان کی سیرت کی تشکیل ہو اور ان کا کیرکٹر بنایا جائے؟ کس طرح ان کو نفس کی مادی ترغیبات اور زمانہ کے خارجی اثرات سے بچایا جائے؟ مادیت اور دین و ایمان کے درمیان جو ایک عالمگیر معرکہ درپیش ہے، ان کے اندر کس طرح ایسی قوت پیدا کی جائے کہ وہ اس معرکے سے کامیاب ہو کے نکل سکیں؟

استاد کو فنِ تعلیم سے فطری مناسبت ہو

اس کے لیے کسی اصول تعلیم پر لکھی ہوئی کسی ایک کتاب پر انحصار نہیں کیا جا سکتا، اس میں دو چیزوں کی شرط ہے:
ایک تو یہ کہ استاذ کو فن تعلیم سے فطری مناسبت اور خداداد ذوق ہو، وہ معلم پیدا ہوا ہو، اور اگر وہ معلم پیدا نہیں ہوا تو کم از کم اس نے اپنے موضوع سے اتنی مناسبت پیدا کر لی ہو کہ اس کو انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہ ہو۔

استاد مجتہد ہو

یہ اصول ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے، اور قیامت تک تسلیم کیا جائے گا کہ معلم درحقیقت مجتہد ہوتا ہے، اسکولوں میں دینیات کے لیے لگے بندھے اصول ہمیشہ کام نہیں دے سکتے، اور نہ استاد کو آپ اس کا پابند بنا سکتے ہیں، استاد میں دل و دماغ سے سوچنے اور راستہ پیدا کرنے کی

صلاحیت ہونی چاہیے، وقت پر اس کو ایسا معلوم ہو کہ الہام ہوا ہے، مجھے ایک عرب ماہر تعلیم کا یہ جملہ بہت پسند آیا: ''لَا یَکُوْنُ الْمُعَلِّمُ مُعَلِّماً حَتّٰی یَکُوْنَ مُلْهَماً''، کوئی استاد اس وقت تک حقیقی معلم اور استاذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کو القا نہ ہوتا ہو، اس کو یہ نہ محسوس ہوتا ہو کہ کوئی چیز اس وقت اس کے دل میں ڈالی گئی ہے، اس لیے کسی استاد کو محض طفل مکتب فرض کر لیا جائے کہ وہ ہر ہر چیز دیکھ کر عمل کرے، پہلے وہ کتاب دیکھے پھر بچوں کو یا طلبہ کو پڑھائے، اس بارے میں تو خود اس پر اعتماد کرنا پڑے گا، اگر اس میں بات میں بات پیدا کرنے اور اپنا راستہ خود نکالنے کی صلاحیت نہ ہو، تو وہ کبھی کامیاب استاذ نہیں ہو سکتا۔

استاد داعی ہو

دوسری شرط یہ ہے کہ استاذ داعی ہو، جس موضوع کی تعلیم وہ دینا چاہتا ہے، وہ اس کا مجسم نمونہ ہو، ان کی زندگی اس کا پرتو ہو، بلکہ زندگی اس کا پرتو کامل ہو، وہ جب سامنے آئیں تو معلوم ہو کہ مسلمان ایسا ہوتا ہے، ایک معلم اخلاق ایسا ہوتا ہے، ایک ایثار پیشہ آدمی ایسا ہوتا ہے، ایک پاکباز اور نیک سیرت انسان ایسا ہوتا ہے، ان کی تلقین اور عمل میں کلی مطابقت ہو، اور ان کے چہرے کا نور بتاتا ہو کہ وہ سراپا عصمت وصداقت ہیں، یہ سراپا اخلاص ہیں، ان کے علم میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی۔

کامیاب معلم

ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم سے، جب کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، میں نے یہ عرض کیا تھا کہ مجھے ہمیشہ سے اس کے بارے میں بڑا تردد رہا کہ دینیات کے لیے ایسے معلمین کا انتخاب کیا جائے جو معاشی اور علمی حیثیت سے پسماندہ ہوں، زندگی کے دھارے سے بالکل الگ ہوں، اور یہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ دینیات کے سوا کچھ نہیں جانتے، ایسے مولویوں کا انتخاب کیا جائے جن کا معاشرہ میں بھی کوئی اونچا مقام نہ ہو، اور نوجوان ان کو زندگی سے علاحدہ دیکھتے ہوں، اور ان کا کوئی خاص احترام نہ ہو، زندگی کے

مسائل سے بھی ان کو کچھ زیادہ ربط نہ ہو، میں نے کہا کہ اگر آپ کو فلاسفی ڈپارٹمنٹ یا آرٹس اور سائنس ڈپارٹمنٹ سے ایسے اساتذہ مل سکیں جو اسلام پر پورا عقیدہ رکھتے ہوں، دینیات سے بقدرِ ضرورت واقفیت رکھتے ہوں، وہ زیادہ اثر انداز ہو سکتے ہیں، مجھے یہ معلوم ہے کہ مسئلہ اس آسانی سے طے کرنے کا نہیں ہے، اس میں بہت سی عملی ٹکنیکل اور وقتی دشواریاں ہیں، ان پر بحث کرنے کے لیے زیادہ وسیع وقت چاہیے۔

میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ معلمین کے انتخاب میں اس بات کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان کا نہ صرف اخلاقی اثر ہو بلکہ ان کا ذہنی تفوق بھی قائم ہو، وہ مسائل کو سمجھتے ہوں، زندگی کے مسائل سے باخبر ہوں، وہ زندگی کے کنارے نہ ہوں بلکہ بیچ منجدھار میں ہوں، وہ عہد گذشتہ کے انسان نہ ہوں، بلکہ اسی عہد اور اسی دور کے انسان ہوں، اگر ادب و شاعری اور فنون لطیفہ کا مسئلہ چھڑ جائے، سیاسی مسئلہ موضوع بحث ہو، تو اس پر وہ آزادانہ رائے دے سکیں اور اپنی واقفیت کا نقش قائم کر سکیں، اور ان کے دل و دماغ میں ایک چنگاری فروزاں ہو، وہ طالب علم کو اپنا جیسا بلکہ اپنے سے اچھا بنانا چاہتے ہوں، ان کی غذا، ان کی دوا، ان کے دل کی تسکین اور ان کی زندگی کے لیے جواز ہی یہ ہو کہ وہ اپنے عقیدہ کو اپنے عزیز طلبہ، اپنے لختِ جگر جو ملت کے لختِ جگر ہیں، ان میں منتقل کر دیں، ان کو اگر روکا جائے اور ان کے پاؤں میں بھاری بیڑیاں ڈال دی جائیں اور ان کی زبان پر مہر لگا دی جائے، پھر بھی وہ بیتاب ہوں، اس بت خانہ میں اذان دینے اور اس صنم کدہ میں حق کی آواز بلند کرنے کے لیے۔

اگر ہمارے اساتذہ ایسی بے چین روح اور ایسا بیتاب جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں، اتنی غیر محدود صلاحیت کے مالک ہیں، ان کا رشتہ تعلیم سے براہ راست ہے، تعلیم نے ان کے کانوں میں اپنا راز کہا ہے، اور خدا کی مدد ان کے ساتھ شامل ہے، اور اپنے کو اس کا نمائندہ سمجھتے ہیں، تو وہ کامیاب معلم ہیں، ہزار آندھیاں چلیں، الحاد کے طوفان اٹھیں، کیسے کیسے زلزلے آئیں، لیکن ان کا جلایا ہوا چراغ روشن رہے، جیسے اقبال نے کہا ہے:

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

دینیات کی تعلیم کی کامیابی کا سب سے بڑا راز

سارے ضوابط، ساری اصطلاحات اور فن تعلیم کی ساری موشگافیاں ایک طرف اور یہ جذبۂ بے تاب، یہ بے چین روح اور غیر محدود صلاحیت ایک طرف، جس طرح آگ اپنا کام کرتی ہے اور پانی کا سیلاب اپنا راستہ خود پیدا کرلے گا، یہ ہے دینیات کی تعلیم کی کامیابی کا سب سے بڑا راز، ایسے لوگوں کو کچھ سکھانے کی ضرورت نہیں، ایسے لوگ اپنے فن کے متعلم نہیں معلم ہوتے ہیں، ایسے لوگ اپنے فن میں مقلد نہیں مجتہد ہوتے ہیں، ایسے لوگ اپنے فن میں پیرو نہیں امام ہوتے ہیں، آج ہندوستان میں اسی قسم کے معلمین کی ضرورت ہے، آپ ان لوگوں کی زندگی کی کہانی پڑھیں جنھوں نے دنیا میں کچھ کام کیا، اور اپنے زمانہ کو کچھ پیغام دیا، جنھوں نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے اندر بے چینی پیدا کردی ہے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ انہی اساتذہ کے احسان مند ہیں، جنھوں نے ان کے اندر یہ چنگاری روشن کردی۔

آپ تعلیم کے مسئلہ پر آزادی کے ساتھ اظہار خیال کریں، تھوڑی دیر میں ہمارے فاضل مقالہ نگار اپنی زندگی کے تجربات آپ کے سامنے رکھیں گے اور مختلف نقطہ ہائے نظر آپ کے سامنے آئیں گے، آپ ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، آپ ان کو موقع دیں کہ وہ اپنے خیالات پیش کریں۔

آخر میں پھر عرض کروں گا کہ معاملہ بہت غور طلب ہے، وہ اتنا سرسری نہیں کہ چند پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کسی خاص مکتب فکر کا شکوہ کریں کہ انھوں نے زمانہ کا ساتھ نہیں دیا، معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

از سر نو نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت

اس وقت ساری دنیا میں ایک تعلیمی بے چینی پائی جاتی ہے، اگر ہمارے سیاسی رہنماؤں کو ان کے سیاسی مشاغل فرصت دیتے، ان کے اندر یہ اخلاقی جرأت ہوتی تو اس پورے نظام تعلیم کی از سر نو اوور ہالنگ کرتے، عربی مدارس کے ایک وکیل کی حیثیت سے میں یہ بات نہیں کہہ رہا ہوں، میرے لیے کوئی معذرت کی بات نہیں؛ بلکہ ایک ایسے حقیقی انسان کی حیثیت سے جو

زندگی کے میدان سے کنارہ کش نہیں، کہ پوری دنیا کا نظام تعلیم اپنی افادیت بڑی حد تک کھو چکا ہے، اور یہ دنیا کی بڑی بدقسمتی ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر اور معاشی مسائل ہمارے قومی رہنماؤں پر اتنے حاوی ہیں کہ ان کو تعلیم کے بنیادی مسائل پر سوچنے کی فرصت نہیں، اور اگر کسی کو فرصت ہوتی ہے تو اس کو اس بارے میں جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی توفیق نہیں۔

کیمبرج اور آکسفورڈ میں تعلیمی قدامت

ہمارا پورا نظام تعلیم عرصے سے لکیر کا فقیر بنا ہوا ہے، اس میں عربی مدارس کی تخصیص نہیں، میں نے کیمبرج اور آکسفورڈ کو دیکھا، اور میں قصداً وہاں گیا، ایک معلم کی حیثیت سے گیا، ایک زائر وسیاح کی حیثیت سے نہیں، میں آپ کے سامنے شہادت دیتا ہوں کہ میں نے وہاں کے بہت سے شعبوں میں قدامت پائی، اور آج ہمارا معاملہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے نقش قدم پر بھی نہیں ہے، اس کے بھی کامیاب اور صاحب شعور مقلد نہیں۔

ہندوستان کا نظام تعلیم نہ مشرقی ہے نہ مغربی

ہمارے ہندوستان کا نظام تعلیم نہ مشرقی ہے نہ مغربی، نہ قدیم نہ جدید، آپ قدیم نظام تعلیم کی شکایت کریں، میں اس کا وکیل نہیں، میرا تعلق اس حلقہ سے ہے جس نے قدیم نظام تعلیم کے مقابلہ میں ایک جامع نظام تعلیم کی دعوت دی، لیکن میں کہوں گا کہ قدیم نظام تعلیم کم از کم قدیم نظام تو ہے، وہ قدامت کو پکڑے ہوئے ہے، اور آپ نے نہ قدامت کو پکڑا ہے نہ جدت کو، اس وقت کا نظام تعلیم تو ایک ایسا شتر مرغ ہے جو نہ قدیم ہے نہ جدید، اگر میرے الفاظ میں کسی قدر شدت یا تلخی آگئی ہو تو مجھے معاف کریں، کہ یہ ایک حقیقت ہے جس کا اظہار ضروری ہے۔

ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو سیاسی اثرات سے آزاد ہو

اس وقت ایک نئے تعلیمی فکر، تعلیمی تخیل اور تعلیمی اجتہاد کی ضرورت ہے جو یورپ کا پابند نہ ہو، جو نہ مشرقی محاذ کا پابند ہو، نہ مغربی محاذ کا، سیاسی اثرات اور مصالح ومفادات سے بالکل

آزاد ہو، وہ نہ کسی سیاسی پارٹی کے زیر اثر ہو، نہ کسی حکومت کے دباؤ میں، اس میں کہیں آس پاس بھی اس کا خیال نہ ہو کہ یہ نظام تعلیم فلاں سیاسی پارٹی کے لیے یا نظام حکومت یا فلاں سیاسی ڈھانچہ کے لیے مفید ہوگا یا نہیں؟

نظام تعلیم کے لیے قرآن سے ہدایت حاصل کیجیے!

نظام تعلیم اس سب سے بالاتر ہے، نظام تعلیم کی حکمرانی ساری سیاسیات اور معاشیات پر ہونی چاہیے، نظام تعلیم سیاست دیتا ہے، معاشیات دیتا ہے، نظام تعلیم ایک مقدس چیز ہے، اس کو سیاست اور سیاسی مقاصد کا ہرگز پابند نہیں کیا جاسکتا، نظام تعلیم زبانوں کے مسئلہ سے بالاتر، کتابوں کے ردو بدل سے بالاتر ہے، اس کا مسئلہ صرف یہ نہیں کہ ایک کتاب کو ہٹایا اور ایک کو بڑھایا جائے، نظام تعلیم کی توہین ہے اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ مراٹھی اور اردو زبان کا مسئلہ ہے یا یہ کہ فلاں ریاست کا مسئلہ ہے، وہ نبوت کا عطیہ ہے، وحی الٰہی کا پروردہ ہے، اس کا براہ راست انسان کی روح اور اس کے ضمیر سے تعلق ہو، وہ ان پستیوں پر اترنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا، نظام تعلیم کے لیے قرآن سے ہدایت حاصل کیجیے، انبیائے کرام کے صحیفوں سے رہنمائی حاصل کیجیے، قوموں اور تاریخ انسانی کے وسیع تجربات سے جو قوموں اور ملکوں کے حدود سے بالاتر ہیں، جو مشرق و مغرب کی پابندیوں سے آزاد ہیں، آپ ان سے رہنمائی حاصل کیجیے۔

ناکام نظام تعلیم

نظام تعلیم کے سامنے اچھے انسان پیدا کرنے کے سوا کوئی پاکباز انسان، فرشتہ سیرت انسان، سچے محبّ وطن انسان اور صاحب ضمیر و صاحب اصول انسان پیدا کرنے کے سوا کوئی اور مقصد نہ ہونا چاہیے، نظام تعلیم کے لیے اس سے بڑھ کر ازالۂ حیثیت عرفی کا جرم نہیں ہوسکتا کہ اس کو ان حدود و ثغور کے اندر پابند کردیا جائے، وہ نظام تعلیم کس کام کا اور اس کی کیا قدر و قیمت ہے جو ایک ''کف جو'' کی قیمت کی ترغیب دے، جو چڑھتے سورج کا پجاری بنائے، وہ نظام تعلیم جو اپنے کو دنیا کی منڈی میں نیلام پر چڑھائے، جو زیادہ بولی بولے اس کے ہاتھ اپنے کو بیچنے کے لیے تیار ہوجائے، جس کے لیے کسی مقصد اور عقیدہ کی

قید نہ ہو، اس کو ہر اس کام میں استعمال کیا جا سکتا ہو جس میں اس نے ایک دن بھی محنت نہیں کی، اور جو عقیدہ اور ذوق سے مطابقت نہیں رکھتا، بشرطیکہ آپ اس کو قیمت دیتے ہوں، نظام تعلیم کی اس سے بڑھ کر ناکامی نہیں ہو سکتی۔

قدیم دینی مدارس کا کارنامہ

ہمارے قدیم مدارس نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، انھوں نے ایسے آدمی تیار کیے جو اس دنیا کی منڈی میں بکنے کے لیے تیار نہیں تھے، اور آج بھی وہ کہتے ہیں:

بر دایں دام بر مرغ دگر نہ — کہ عنقا را بلند است آشیانہ

آج بھی ایسی مثالیں موجود ہیں اور اس نظام تعلیم ہی کی نہیں، انسانیت کی آبرو انہی انسانوں کے دم سے قائم ہے۔

انتہائی حساس اور نازک کام

حضرات! آپ مجھے معاف کریں، میری یہ صدائے بے ہنگام آپ کے گوش میں اور آپ کے ذوق پر گراں نہ ہو، میں نے جو کچھ آپ سے کہا، وہ یہ کہ جب آپ تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے بیٹھیں تو تعلیم کے مسئلہ کا تقدس آپ کے سامنے ہونا چاہیے، اس کی پہنائی اور وسعت آپ کے پیش نظر رہنی چاہیے، اس کی بلندی اور رفعت آپ کے سامنے ہونا چاہیے، اس کے مزاج کی نزاکت آپ کے سامنے ہونی چاہیے، یہ کوئی ریاضی کا عمل نہیں جس میں جامد اعداد سے کام لیا جاتا ہو، یہ انجینیرنگ کا عمل نہیں جس میں اصول اور پیمانے استعمال کیے جاتے ہیں، یہ ایک انتہائی حساس اور نازک چیز ہے، اس کا دماغ شاہانہ اور ضمیر درویشانہ ہے۔ (۱)

---

(۱) ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں منعقد ایجوکیشن کانفرنس میں یونس سلیم صاحب (سابق گورنر بہار، سابق مرکزی وزیر حکومت ہند) نے عربی مدارس کو آڑے ہاتھوں لیا اور جی بھر کے تنقید کی، وہ اس وقت نائب مرکزی وزیر تھے، حضرت مولاناؒ اس اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے، انھوں نے اپنی اس تقریر میں یونس سلیم صاحب کی پیدا کردہ غلط فہمیوں اور تنقیدوں کا مسکت جواب دیا، ماخوذ از ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لکھنؤ (شمارہ ۲، ۹ اور ۱۶ / جولائی ۱۹۷۲ء)۔

نصاب تعلیم قوم کے فکری ارتقا

اور

ذہنی صلاحیت کا آئینہ دار ہوتا ہے

حضرات! میں اپنی دینی، علمی اور تعلیمی برادری کے معزز اور عزیز ارکان کا، اس برادری کے ایک حقیر خادم اور اس برادری کے ایک تاریخی مرکز میں استقبال کرتا ہوں، میں آپ لوگوں کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اور اس عباسیہ ہال میں، جہاں آپ اس وقت جمع ہیں، خیر مقدم کرتا ہوں، اس عباسیہ ہال میں جس نے دور ماضی کے بڑے اعلیٰ اور بلند پایہ دینی و علمی مناظر دیکھے ہیں اور جس کی شہ نشین سے اپنے عہد کے نامی وگرامی، ملکی و غیر ملکی فضلاء، زعماء اور ماہرین تعلیم نے خطاب کیا ہے۔

نصاب تعلیم کا مسئلہ

حضرات! آج کا موضوع نصاب تعلیم ہے، نصاب تعلیم کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر رواروی کے ساتھ کوئی رائے قائم کرلی جائے، یا کسی عجلت اور جذباتیت کے ساتھ فیصلہ صادر کردیا جائے، یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے، نہ اس کو معصوم قرار دینا صحیح ہے، نہ اس کو کاملاً ناقص اور قابل ترک ثابت کرنا آسان ہے، حقیقت میں نصاب تعلیم کسی قوم کے فکری ارتقا، اس کے علمی تجربوں، اس کے طریق فکر اور اس کی ذہنی صلاحیت کی ہانڈی کا سرجوش ہوا کرتا ہے، نصاب تعلیم کسی قوم کے مطالعہ، اس کی فکری سطح اور اس کی ذہنی صلاحیت کا نقطۂ عروج

(Climax) ہوتا ہے، اس لیے کسی نصاب تعلیم پر اس قوم کے علمی تجربوں، اس ملت کی عملی نمائندگی کرنے والے گروہ کی نفسیات اور اس ملک کے ماحول سے الگ کر کے غور نہیں کیا جا سکتا، نصاب تعلیم اس ماحول کا ایک علمی اظہار ہوتا ہے، نصاب تعلیم کا بھی ایک ضمیر ہوتا ہے، اور اس کی ایک روح ہوتی ہے، جو اس کے پورے جسم میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے، نصاب تعلیم کچھ بے جوڑ چیزوں کے جمع کر دینے اور پڑھائی جانے والی چند کتابوں کے بے جان مجموعہ کا نام نہیں، نصاب تعلیم کسی ملت یا کسی علمی گروہ کی اپنی ضروریات کے احساس، اپنے زمانہ کے تقاضوں کے سمجھنے اور پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کا ماحصل ہوتا ہے، اس لیے بڑی زیادتی ہوگی کہ کتابوں کی فہرست سامنے رکھ کر ہم رائے قائم کرتے چلے جائیں کہ یہ کتاب اچھی ہے، یہ کتاب اچھی نہیں، یہ کتاب کامیاب، یہ کتاب ناکام، اس فن کا یہ حصہ زیادہ ہے، یہ حصہ کم، یہ نصاب تعلیم کے ساتھ ہی نہیں، علمی حقائق کے ساتھ بھی ناانصافی ہوگی۔

قدیم نظام تعلیم پر ایرانی اثرات

یہ نصاب تعلیم جو ہندوستان میں صدیوں سے رائج تھا، اور جس کی ایک ترمیم شدہ اور ترقی یافتہ شکل درس نظامی کی شکل میں ہے، جو استاذ العلماء ملا نظام الدین (اور مجھے اس کے اظہار میں مسرت اور فخر ہے کہ آج ہم انھیں کے شہر میں بیٹھ کر اور ان کے مرکز علمی سے تھوڑے فاصلے پر یہ گفتگو کر رہے ہیں) کا مرتب کیا ہوا ہے، یہ نصاب درحقیقت ایران کا ساختہ پرداختہ ہے، یہ ایران کے ذہن کا انعکاس ہے، یہ نصاب اصلاً ایران کا عطیہ ہے جو ہندوستان کو ملا، اس لیے کہ جس عہد میں یہ نصاب متعارف ہوا، وہ عہد حکمرانی اور سیاسی طاقت کے لحاظ سے تو ترکی النسل لوگوں کا عہد ہے، لیکن تہذیبی اور فکری اعتبار سے وہ ایرانیوں کا عہد ہے، ہندوستان کی تاریخ کی یہ تقسیم ہے کہ اس کی سیاسی تاریخ ترکوں اور مغلوں کے زیر سایہ پروان چڑھی، اور علمی وفکری تاریخ ایرانیوں کے زیر سایہ پروان چڑھی، اور اس پر حقیقت میں ایرانیوں کا اقتدار قائم رہا ہے، اس ملک میں سیاسی حیثیت سے مغل یا افغانی النسل خاندان حکمرانی کرتے تھے، ان سے پہلے ترک حکمرانی کرتے تھے، لیکن فکری اور

ذہنی حیثیت سے یہاں ایرانی حکمرانی کرتے تھے، اور ایران حقیقت میں مشرق کا یونان ہے، ایران اور یونان میں مماثلت کی اتنی باتیں ہیں کہ اگر فلسفہ تاریخ کا کوئی طالب علم یہ ثابت کرنا چاہے کہ یونان کا مشرق میں بُروز ایران کی شکل میں ہوا، یا ایران کا مغرب میں بُروز یونان کی شکل میں ہوا، تو شاید غلطی نہیں ہوگی۔

ہمارے اس قدیم نصاب کا قوام (اور قوام اصل چیز ہوتی ہے) ایران میں تیار ہوا ہے، اور ایران کی کچھ خصوصیات ہیں، جس میں ذہانت، لطافت ذوق، ادبی حاسہ، اور شاعری کا فطری ملکہ اس کی قومی اور نسلی خصوصیت ہے، ان سب کے ساتھ ایک چیز اور ہے، وہ ہے جس کو ہمارے یہاں اردو میں ''رائی کا پربت بنانا'' کہتے ہیں، اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے ''الفرقان'' کے ''شاہ ولی اللہ نمبر'' میں اس کو ''بات کا بتنگڑ بنانے'' کے بلیغ لفظوں میں ادا کیا ہے، یہ ایران کی صدیوں کی نسلی خصوصیت و وراثت ہے، کہ وہ ''رائی کا پربت'' اور ''بات کا بتنگڑ'' بنا دیتا ہے، یہاں پر عرب کی فطرت اور عجم کی فطرت (اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ عجم کا لفظ ہمارے قدیم لٹریچر میں جب بولا جاتا ہے تو اس سے مراد ایران ہی ہوا کرتا ہے) ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہے، عرب کی فطرت میں سادگی، ایجاز، واقعیت پسندی اور عملیت ہے، اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کے لیے عرب کی سرزمین اور عرب قوم کے انتخاب کرنے میں یہ حکمت بھی تھی۔

ایجاز لفظی ہی نہیں ہوتا، ایجاز لسانی ہی نہیں ہوتا، ذہنی ایجاز بھی ہوتا ہے، اور ذہنی ایجاز کو لسانی ایجاز پر ترجیح وفوقیت حاصل ہے، بعض قوموں اور افراد کا ذہن ایجاز پسند ہوتا ہے، اور بعض کا طوالت پسند ہوتا ہے، ذرا سی چیز کو جب تک پھیلا کر ان کے سامنے نہ لایا جائے، ان کا ذہن اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہوتا ہے، اس دین کو چونکہ قیامت تک رکھنا تھا، اور مختلف ادوار اور مختلف ملتوں کے لیے اس کو آخری پیغام بننا تھا، اللہ تعالیٰ نے عربوں کا انتخاب کیا، کہ جو بات کے (اس کے حدود اور دائرہ میں رہتے ہوئے اور اس کے درجۂ حرارت و برودت کے مطابق) سمجھنے کے عادی تھے، ذہن اس کو اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، پھر اس کو بے کم وکاست پہنچانے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا، اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی

حفاظت کے لیے بھی اور حدیث کی اشاعت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے عربوں ہی کا انتخاب کیا، اور میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جہاں جہاں اسلام عربوں کے ذریعہ سے گیا ہے، وہاں اپنی حقیقی شکل میں گیا ہے، بلا تحریف، بلا غلو ومبالغہ کے گیا ہے۔

حدیث کے ساتھ بے اعتنائی کے اسباب

اس کے ساتھ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان ملکوں میں جہاں عرب اسلام کو لے کر گئے ہیں، وہاں حدیث کی اشاعت ہوئی ہے، اور جہاں غیر عرب عناصر کے ذریعہ سے اسلام گیا ہے، وہاں حدیث بہت بعد میں آئی ہے، اور آپ سراغ لگائیں گے تو کسی عرب ملک سے اس کا ربط ملے گا، عرب فطری طور پر غلو ومبالغہ سے مناسبت نہیں رکھتے تھے، ابن رشیق قیروانی کی کتاب "العمدة" میں آتا ہے کہ کسی نے حضرت سعید بن المسیبؒ سے کہا کہ: "إن أناساً يكرهون إنشادَ الشّعرِ في المسجدِ" انھوں نے کہا کہ "لقد نَسَكوا نُسُكاً عَجمياً" بعض لوگ مسجد میں شعر پڑھنے کو مکروہ سمجھتے ہیں، تو انھوں نے کہا: یہ عجمی زہد ہے، عربی زہد نہیں ہے۔

اس نسک عجمی کا تعلق عبادات ہی سے نہیں، نسک اعجمی کا تعلق علوم سے بھی ہے، حقائق سے بھی، ان کی ترجمانی سے بھی، ان کی مقدار کے تعین سے بھی ہے، کتنی چیز ہو اور کس مقدار میں اس چیز کو لینا چاہیے اور اشیاء کا کیا تناسب ہو؟ اس میں عربی دماغ صحیح تناسب کی طرف چلتا ہے، عجمی دماغ عدم تناسب کی طرف چلتا ہے، قرآن کہتا ہے: ﴿كَانَ أَمْرُهُ فُرُطاً﴾ [سورة الكهف: ۲۸] یعنی وہ افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

دقت پسندی

اس ایرانی ذہن کے خصائص میں سے ایک "دقت پسندی" ہے، یعنی وہ کسی بات کو سیدھی سادی شکل میں سمجھنے اور پھر اس سے زیادہ آگے کی منزل یہ کہ اس کا ذوق لینے سے قاصر تھے، جب تک کہ کوئی بات پیچ دار طریقہ سے نہ کہی جائے، اس میں گہرائی نہ ہو، اس وقت تک ایرانی ذہن اس کی قدر نہیں کرتا، آپ ایران کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو

''مزدک'' کے وقت سے، مجوسیت کے عہد سے لے کر اس عہد تک، آپ سب جگہ یہ ذہن پائیں گے کہ وہ سیدھے سادے اسلام پر قانع نہیں ہے، جب تک اس میں کوئی ''نسک عجمی'' یا غلو و مبالغہ، افراط و تفریط شامل نہ ہو، اس کا نقطۂ ارتقاء وہ ہے جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں:

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

تعدد و تنوع

ایرانی ذہن کا دوسرا خاصہ ہے: احتمال آفرینی، ہر چیز میں تعدد و تنوع، یعنی ایک چیز پر وہ کفایت نہیں کرتا، فرض کیجیے کہ یہ بات ہے کہ مصنف نے کتاب کی ابتدا کرتے ہوئے حمد و صلوٰۃ کیوں چھوڑ دیا؟ مصنف نے کتاب میں خطبۂ مسنونہ کیوں نہیں لکھا؟ عرب اس کی ایک تاویل پر اکتفا کرے گا، لیکن ایرانی ذہن اس میں ایسی موشگافی سے کام لے گا اور ایسی دور کی کوڑی لائے گا کہ مصنف بھی سنے تو حیران رہ جائے اور بول اٹھے:

ع   شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

ایک لطیفہ

یہ ذہن علمی حلقہ سے نکل کر قومی حلقہ میں آجاتا ہے اور وہ لوگ بھی جو تعلیم و تعلم کا کام نہیں کرتے، اسی طرح سوچنے لگتے ہیں، میں ایک لطیفہ سناتا ہوں جس سے شاید کانوں کا ذائقہ بھی بدل جائے، کوئی عباسی خلیفہ یا وزرائے سلطنت میں سے کوئی اہم شخص اپنی مملکت کے کسی حصہ میں گئے تو ان کے اعزاز میں وہاں توپ نہیں چلی، انھوں نے وہاں کے گورنر کو بلایا اور کہا کہ ہمارے اعزاز میں توپ کیوں نہیں چلی؟ یہ تو توہین ہوئی!!، انھوں نے کہا: اس کے دس وجوہ ہیں، انھوں نے بھی شاید کوئی کتاب نحو یا منطق کی پڑھی ہوگی، انھوں نے کہا: کیا؟ بتاؤ۔ انھوں نے کہا: سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ بارود نہیں تھی، انھوں نے کہا: بس اب زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، جب بارود نہیں تھی تو اس کے بعد اب کہنے کی کیا ضرورت ہے، بارود نہ ہو تو توپ کیسے چل سکتی ہے؟ لیکن وہ صاحب تیار تھے کہ اس کے بعد بھی وجہ بیان کریں، وہ عملی آدمی تھا، اس نے غالباً

منطق نہیں پڑھی تھی، اس نے اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا، کہ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، نہ میرے پاس فاضل وقت ہے، نہ تمھارے پاس، آپ کسی عربی النسل، عربی الذوق مصنف کی کتاب میں بلاوجہ اسباب وعلل کی اتنی بہتات نہیں پائیں گے، یہ ایرانی ذہن ہے۔

فقہ وقانون

میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کسی نصاب کے متعلق کوئی رائے اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ اس پر زمان ومکان کے کیا اثرات پڑے ہیں؟ اس لیے کہ نصاب تعلیم کو نہ زمان سے علاحدہ کیا جاسکتا ہے نہ مکان سے، آپ سب کو معلوم ہے کہ پہلے ہندوستان میں وہ محور جس کے گرد سارا نصاب گردش کرتا تھا، وہ فقہ کا علم تھا، اس لیے کہ یہاں حکومت کرنی تھی، یہاں کا آئین اسلامی تھا، شریعت محمدی پر عمل ہوتا تھا، اس لیے عملی ضرورت یہ تھی کہ فقہ پر اچھی اور عمیق نظر ہو، تو سب سے پہلے ہندوستان میں جب نصاب درس جاری ہوا، اس وقت فقہ کی اس پر حکمرانی تھی، فقہ کا حصہ اور اس کی چھاپ سب سے زیادہ گہری تھی، اس کے بعد اصول فقہ کا نمبر آیا، جب اصول فقہ نے ایران میں اور ایران سے باہر خاص حالات واسباب کی بنا پر ترقی کی، اور اس پر موشگافیاں ہوئیں، اور وہ ایک بہت بڑا عالم بن گیا، تو اصول فقہ کا حصہ بڑھا، پھر جب علامہ وجیہ الدین گجراتی،(۱) مولانا عبداللہ(۲) اور مولانا عزیز اللہ (ملتانی) ایران گئے اور وہاں کے بلند پایہ اساتذہ سے جن کو علوم حکمت میں توغل تھا، پڑھ کر آئے، اس کے بعد امیر فتح اللہ شیرازی اور حکیم علی گیلانی ایران سے آئے، تو جیسا کہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے (آپ حضرات کی خدمت میں میرے والد ماجد کا رسالہ ''ہندوستان میں قدیم نصاب درس'' جو ہزاروں صفحات کے حوالہ کا نچوڑ ہے، پیش کیا جائے گا، اور میں آپ حضرات سے یہ گزارش کروں گا کہ آپ اس پر ضرور ایک نظر ڈالیں، انھوں نے ہندوستان میں ہر عہد کا نصاب مرتب شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے) کہ

---

(۱) مولانا وجیہ الدین گجراتی نے ایران جاکر علامہ عماد الدین محمد بن محمود الطارمی سے تعلیم حاصل کی

(۲) وہ ایران کے مشہور فاضل علامہ عبداللہ یزدی کے شاگرد تھے۔

جب یہ ایرانی عنصر آیا، تو ہندوستان پر اس کا گہرا اثر پڑا، اس تعلق کی تجدید بھی برابر ہوتی رہی، ہمارا موجودہ نصاب درس جس کو ملا نظام الدین کے ذریعہ توانائی اور زندگی ملی، وہ درحقیقت امیر فتح اللہ شیرازی کا پروردہ یا ساختہ پرداختہ ہے، وہ ایرانی ذہن کا عکاس تھا، فکری طور پر بھی، ادبی طور پر بھی، (اس کے شواہد آپ شعر العجم میں دیکھیں گے) ہندوستان کا ذہن اسی نصاب کو قبول کرنے کے لیے جو درس نظامی کی شکل میں ہم کو ملا، پورے طور پر تیار ہو چکا تھا۔

درس نظامی کی خصوصیات

میں یہ بھی عرض کردوں کہ درس نظامی اس زمانے کے علماء کی ذہنی پرواز کا بہترین نمونہ ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ کہا جا سکتا ہے کہ کم سے کم اس عہد میں، یعنی دسویں یا گیارھویں صدی ہجری تک دنیا کے کسی ایسے ملک کا ہم کو علم نہیں جہاں علم کے اندر اتنی گہرائی آ گئی ہو، اتنی وسعت وتنوع پیدا ہو گیا ہو، اور اس کے اندر گل کاریاں پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو، ہم یہ بڑی حق تلفی اور ایک غیر علمی انداز فکر سمجھتے ہیں کہ درس نظامی کو آنکھ بند کر کے یہ کہہ دیں کہ یہ سراپا ناقص ہے، اس میں پھر ہندوستانی مصنف کی دو اہم کتابوں کا اضافہ ہوا: (۱) سلم العلوم (۲) مسلم الثبوت، جو دونوں محب اللہ بہاری کی تصنیف ہیں، ہندوستان کے علمی حلقہ نے اس کو سینے سے نہیں، آنکھوں سے لگایا، اور تنہا مسلم کی بارہ شرحیں لکھی گئیں، اور جامع ازہر کو بھی مجبور ہونا پڑا کہ مسلم الثبوت کو اپنے نصاب میں داخل کرے، اور مسلّم کا حال تو یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ حمد اللہ اور ملا مبین اور پھر اس کے بعد کی شرحیں ساری کی ساری اس کی شرحیں ہیں، یعنی گویا مسلّم ایک معیار فضیلت کے طور پر اور انسان کی ذہانت کے ایک پیمانہ کے طور ایک کتاب آئی، اور پورے علمی حلقہ نے اس کے ساتھ اپنی گرویدگی کا بلکہ شیفتگی کا ثبوت دیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت تعلیم کا صرف ایک ہی نظام تھا، یہ تعلیم کی ثنویت (دوئی) نہیں تھی، ہندوستان میں دو متوازی نظام نہیں چل رہے تھے، تنہا یہی نظام تھا جو قاضی ومفتی بھی پیدا کرتا تھا، مفسر ومحدث بھی پیدا کرتا تھا، اور سول آفیسرس (Civil Officers) بھی پیدا کرتا تھا، یعنی کوئی آدمی جو وزارت عظمی کے عہدہ تک پہنچے یا عدالت کے عہدہ پر پہنچے، یا

انتظامیہ کے کسی بڑے سے بڑے عہدہ پر پہنچے، اس کا کچھ پڑھا لکھا ہونا ضروری تھا، اور پڑھے لکھے ہونے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ وہ جہاں تک پڑھ سکے، جہاں تک اس کے حالات اجازت دیں یا اس کی ہمت ساتھ دے، وہاں تک درس نظامی میں پڑھے، آپ جس کے حالات پڑھیں گے، تعلیم یافتہ لوگوں میں جس کا شمار تھا، معلوم ہوگا کہ کسی نہ کسی درجہ تک متوسطات تک یا ابتدائی کتابوں تک اس نے یہ کتابیں ضرور پڑھی ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس علمی گروہ میں ایک خاص ذہن پیدا ہوا، پھر ان کے اندر جو گویا پورے تعلیم یافتہ اور فاضل نہیں تھے، ان کے اندر بھی کسی نہ کسی درجہ میں یہ ذہن منتقل ہوا، پھر ان کے بعد ان کے ماحول پر اثر انداز ہوا، اس کے بعد ماحول سے نکل کر پڑھی لکھی مسلمان آبادی پر اس کا اثر پڑا، اس کا اثر آپ دیکھنا چاہیں تو اُس زمانے کے علماء کے اختلاف کے میدانوں میں دیکھیں، اظہار خیال کے طریقوں میں دیکھیں، اُن کی تصنیفات میں دیکھیں، پھر یہ بات معاشرے میں آئی، اس لیے کہ نصاب تعلیم پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے، جو نصاب تعلیم ماحول و معاشرہ پر اثر انداز نہ ہو، وہ ناکام نصاب تعلیم ہے، اور اگر اثر انداز ہو تو خطرناک بات ہے، اس لیے ہمیں دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھ کر دیکھنا چاہیے، یہ فرض کر لینا صحیح نہیں کہ نصاب تعلیم سے وہی افراد متاثر ہوتے ہیں جو مدرسہ سے تعلق رکھتے ہیں، فاضل و عالم اگر مدرسہ سے نکل کر اپنے ماحول پر اثر انداز نہیں ہوتے اور ان کا احترام نہیں ہوتا، تو وہ مدرسہ ناکام ہے، وہ نصاب تعلیم ناکام ہے۔

قدیم نصاب تعلیم کی نفسیات

اگر ان کا اثر ہوتا ہے تو دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا اثر ہے؟ کہیں غلط اثر تو نہیں پڑ رہا ہے؟ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان اثرات کو دیکھنے کے لیے آپ کو اس زمانے کی تصنیفات دیکھنی چاہیے، ایک دوسرے کی تردید میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کو دیکھنا چاہیے، مخالفت و تردید میں آخری حد تک پہنچ جانا، اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ دلائل کے ساتھ منوانا اور اس پر اصرار کرنا اور اس میں احتمالات نکالنا، اس نصاب نے یہ ذہن پیدا کیا، اپنی ان تمام خوبیوں اور کمالات

کے ساتھ،لیکن "إِذَا ثَبَتَ الشَّيْءُ ثَبَتَ بِلَوَازِمِهِ" یہ نصاب جب آیا تو اپنے پورے نفسیات کے ساتھ آیا، میں عرض کرتا ہوں کہ نصاب تعلیم کی بھی نفسیات (Psychology) ہوتی ہے، اور جس نصاب تعلیم کی نفسیات نہ ہو، وہ پانی کی سطح پر ہے، اندر نہیں اترا۔

نصاب تعلیم کا زندگی اور معاشرے سے مستحکم ربط ہے

اگر ایک عمل حقیقت کے طور پر سوچا جائے تو بات بہت سیدھی اور صاف ہے کہ نصاب تعلیم کا زندگی سے، معاشرے سے اور طرز فکر سے، اور یہاں تک کہ دینی تصورات سے، اور ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرنے سے، اور یہاں تک عرض کرتا ہوں کہ قرآن و حدیث کے فہم سے مستحکم ربط ہے، آپ اس سے اس کو جدا نہیں کر سکتے، آپ اب یہ دیکھیے کہ قرآن و حدیث کا فہم ہے، آپ قدیم عہد کی تفسیریں دیکھیے اور پھر متأخر عہد کی تفسیریں دیکھیے، خاص طور پر جو بلاد عجم میں لکھی گئیں، تو آپ کو کھلا ہوا فرق معلوم ہوگا، ان میں سادگی ہے، عملیت ہے، حقیقت پسندی ہے، قرآن مجید کے مقاصد سے قرب، نبوت محمدی جو عرب میں آئی، اس سے مناسبت ہے، اور دوسری تفسیروں میں آپ دیکھیے گا تو وہ بات نہیں پائیے گا، بات صرف اتنی ہے کہ نصاب تعلیم انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے، خاص حالات میں بنتا ہے، خاص مقاصد اور مطمح نظر اور ضروریات کے پیش نظر بنتا ہے اور اس میں ایک عہد تک چلنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اگر ہم اس کو یوں کہہ لیں کہ وہ "جسم حیّ ونامیؔ" ہے، جس کی حیات اور نمو ایک خاص عہد تک جاتی ہے، تو پھر اس کے بعد بات مختصر اور آسان ہو جاتی ہے، اگر ہم اس کو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معصوم چیز ہے، یا آسمان سے نازل ہوا ہے، یا ایسے مقدس ہاتھوں کا مرتب کیا ہوا ہے کہ جس کے بعد اب اس پر غور کرنا ایک طرح کی بے ادبی ہے، تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی علمی نقطۂ نظر اور معروضی طریقہ پر ہو

اس موقر مجلس اور آپ جیسے حضرات کو جو پورے علمی ہندوستان کی نمائندگی کر رہے ہیں، اس لیے تکلیف دی گئی ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ، حقیقت پسندی کے ساتھ، اور پورے

انصاف وتوازن کے ساتھ غور کریں کہ جو چیز ان میں سے اب قابل تبدیلی ہوگئی ہیں، ان کو تبدیل کریں، لیکن وہ تبدیلی جو ہو، وہ بے سوچے سمجھے نہ ہو، وہ کسی جذبہ کے ماتحت یا کسی رد عمل کے نتیجہ میں نہ ہو، بالکل علمی نقطۂ نظر سے اور معروضی طریقہ پر ہو۔

نصاب تعلیم میں تبدیلیاں عہد بہ عہد ہوتی رہیں

دارالعلوم دیوبند نے اپنے صد سالہ اجلاس میں مجھے یہ اعزاز بخشا کہ نصاب تعلیم پر جو سیمینار تھا، مجھے اس کی صدارت تفویض کی گئی، میں نے کہا کہ حضرات! میں آپ سے اول تو یہ بات کہتا ہوں کہ نصاب تعلیم کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے اسلاف ہم سے کہیں زیادہ حقیقت پسند اور ہم سے کہیں زیادہ وسیع النظر اور کہیں زیادہ فراخ دل تھے، اس لیے کہ ہمیں نصاب تعلیم کی پوری تاریخ میں نظر آیا کہ برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں، اور معیار فضیلت بھی بدلتا رہا، پہلے فقہ، پھر اصول فقہ، پھر اصول حکمت، اور حدیث بہت بعد میں آئی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کوششوں سے اس کا سکہ چلا، دوسری بات یہ ہے کہ یہ تضاد ہے تاریخ کا، جس کو آپ حضرات کے سامنے رکھا جا سکتا ہے، کہ جب ہندوستان میں ایک ہی حکومت تھی، یعنی صرف مسلمان حکومت کر رہے تھے، صرف خاندان بدلتے تھے، خاندان غلاماں آیا، پھر تغلق آئے، لودھی آئے، پھر سوری آئے، اور پھر مغل آئے، تو جب تسلسل تھا اسلامی حکمرانی (Sovereignity) میں اقتدار اعلیٰ مسلمان کا تھا، اقتدار اعلیٰ ایک تھا، اس کا دین ہی نہیں بلکہ مذہب فقہی بھی ایک تھا یعنی حنفی، آئین بھی ایک تھا یعنی شرع محمدی، اس کی زبان ایک تھی یعنی فارسی، اور مذہبی زبان عربی تھی، اور تہذیب بھی ایک ہی تھی یعنی: ایرانی، عربی، ہندوستانی تہذیب کا آمیزہ، سب میں وحدت تھی اور تسلسل تھا، اس وقت تو نصاب تعلیم سو سو برس میں بدلتا رہا، اور جب زمین وآسمان بدل گئے، اور نہ وہ حکمرانی رہی، (Sovercignity) رہی، اور نہ وہ تہذیب رہی، اور نہ وہ آئین رہا، اور مذہب بھی تزلزل میں پڑ گیا، اس وقت سے اس پر ایسی مہر لگی، ایسی مہر لگی کہ کوئی اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، کیا اس کی بنا پر ایک مؤرخ یہ بے لاگ

فیصلہ نہیں دے سکتا کہ کہ ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ وسیع النظر تھے، اور ہم سے زیادہ حقیقت پسند، اور زمانہ شناس تھے؟ ان کا ہاتھ اور ان کی انگلیاں زمانہ کی اور ملت کی نبض پر رہتی تھیں، اور ہماری انگلیاں نبض سے ہٹ گئی ہیں، اور ہمیں معلوم نہیں کہ نبض کس طرح چلتی ہے؟

طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم میں خوب سے خوب تر کی تلاش طلبہ کا واجبی حق ہے

دوسری بات میں نے یہ کہی، اور ذرا کسی حد تک اپنے حدود سے تجاوز ہو کر میں نے کہا، کہ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ اگر کسی مدرسہ میں اتفاقاً کسی دن رات کی باسی دال طلبہ کو کھانے کو دے دی جائے، تو اس کا کیا اثر ہوگا؟ کیا طلبہ شکایت نہیں کریں گے؟ حالانکہ کسی مدرسہ نے یہ اعلان نہیں کیا کہ ہم تازہ سے تازہ اور عمدہ سے عمدہ کھانا دیں گے، اس کی تو صرف یہ ذمہ داری ہے کہ بہتر سے بہتر تعلیم مہیا کرے، لیکن اس کے بعد بھی لوگ اس پر سخت احتجاج کریں گے کہ رات کی باسی دال دے دی گئی ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اگر ہم واقعی اس بات پر مطمئن ہوں کہ مثلاً ادبیات اور عربی زبان کی تعلیم میں فلاں کتاب زیادہ مفید ہوسکتی ہے اور مقاصد کو اس زمانہ کے بدلے ہوئے حالات میں، جبکہ عرب دنیا سے ہندوستان کے ایسے رابطے پیدا ہوگئے ہیں کہ جو ہندوستان کی پوری ہزار سالہ تاریخ میں کبھی نہیں تھے، پھر دعوت کا ایک میدان نکل آیا، وہاں کے اسلامی قائدین اور یہاں کے بہت سے مخلصین اور علمائے ربانیین کی کوششوں سے، تو اب عربی زبان سکھانے کے لیے یہ طریقہ زیادہ مفید ہوگا اور یہ نصاب زیادہ مفید ہوگا، تو اب بتائیے کہ اس کو کوئی مدرسہ اس لیے نہیں اختیار کرتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے فلاں کتاب پڑھی تھی، تو بتائیے کہ کیا یہ دیانت کے مطابق ہوگا؟ یہ طلبہ کے ساتھ انصاف ہوگا؟ یہ زمانہ کے انصاف ہوگا؟ یہ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس باسی دال سے کہیں زیادہ ایک طرح کی کوتاہی ہے اور حق تلفی ہے، کہ اگر لڑکے باسی دال کھائیں گے، تو ان کے جو اصل مقاصد ہیں، جو مقصد ان کو مدرسہ کی طرف کھینچ کر لایا ہے، اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، لیکن مسلسل ان کو بہترین طریقۂ تعلیم سے محروم رکھنا اور اس پر اصرار کرنا یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

نصاب تعلیم کو ملت کے اساسی مقاصد کا تابع اور خادم ہونا چاہیے

میں ان الفاظ کے ساتھ اس موقر مجلس کا افتتاح کرتا ہوں اور آپ حضرات کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ آپ نصاب پر بالکل غیر جانبدارانہ طریقہ سے اس کے مختلف موضوعات پر غور فرمائیں، اور آپ کے سامنے صرف اپنے ان عزیز نوجوانوں کا مستقبل ہو اور اس عہد کے تقاضے ہوں، اور وہ اساس و مقاصد ہوں جن کا تابع اور خادم نصاب تعلیم ہے، اگر یہ نصاب تعلیم اس ملت کے اساسی مقاصد کے تابع اور خادم نہیں ہے تو اسلامی نصاب تعلیم نہیں ہے،، اس میں کسی قسم کا کوئی تقدس نہیں ہے، (تقدس تو یوں بھی نہیں) وہ قابل احترام بھی نہیں، بس یہ دو چیزیں نوجوانوں کا مستقبل اور عہد کے تقاضے، اس سے بڑھ کر ملت کے اساسی اور کلی اور اصولی مقاصد، جن کا نصاب تعلیم کو ایک ادنی خادم ہونا چاہیے، اور نصاب تعلیم کی اہمیت اور قیمت ساری یہ ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل میں وہ علمی انداز میں علمی میدانوں میں مدد کرتا ہے، بس یہ حقیقت میں نصاب تعلیم کی معنویت اور قیمت ہے، نصاب تعلیم ملت اور عہد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، آثار قدیمہ کی کوئی چیز نہیں ہے کہ آپ میوزیم میں اسے رکھیں اور دکھائیں کہ کسی زمانہ میں ایسا ہوتا تھا، نصاب تعلیم کو ملت کے ساتھ، زمانہ کے ساتھ اور تقاضوں کے ساتھ مربوط رہنا چاہیے، اور یہ ہمارے لیے قرآنی نظریہ سے بھی، دعوتی نظریہ سے بھی اور علمی نظریہ سے بھی ضروری ہے۔

آخر میں آپ حضرات سے معافی چاہتا ہوں، اگر کوئی لفظ ایسا نکل گیا ہو جس سے کسی درجہ میں کسی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو مجھے معاف فرمائیں۔ [1]

---

(۱) ''ہندوستان میں عربی مدارس کے نصاب تعلیم'' کے موضوع پر ''ندوۃ العلماء''، (لکھنؤ) میں منعقد ایک دو روزہ سیمینار کی گئی افتتاحی تقریر، جو مقرر کی نظر ثانی کے بعد ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۲۵ / مارچ، ۱۰ و ۲۵ / اپریل ۱۹۸۴ء) میں شائع ہوئی۔

ہندوستان میں مسلم بچوں کا تعلیمی مسئلہ

شیرازِ ہند جونپور کی علمی تاریخ

اضلاع مشرقی کا یہ اہم تعلیمی اجتماع جس شہر میں منعقد ہو رہا ہے، اس کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں صدیوں دینی وعلمی مرکزیت حاصل رہی ہے، نویں صدی کے بالکل آغاز میں امیر تیمور گورگاں کے حملہ نے جب دہلی کو زیروزبر کیا، تو جونپور کا پایہ دہلی سے بلند ہو گیا، اور بہت سے علمی جواہرات جو سلطنت دہلی کے لیے کوہ نور اور سرمایۂ فخر وسرور تھے، جون پور کی طرف منتقل ہو گئے، انھیں منتقل ہونے والوں میں ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۸۴۹ھ) اور ابوالفتح بن الشیخ عبدالحی بن عبدالمقتدر الکندی (م ۸۵۸ھ) بھی تھے، جن میں سے ہر ایک اپنی ذات سے ایک عظیم الشان دارالعلوم تھا، اور ہر ایک نے فضلائے کاملین فن اور اہل درس کی اتنی بڑی جماعت تیار کر دی جو اس وقت بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے ممکن نہیں۔

سلطان وقت علم کے بوریہ نشین پر قربان ہوتا ہے

یہی وہ سرزمین ہے جہاں تاریخ کی چشم عبرت نے تخت سلطنت کو مسند علم کے سامنے جھکتے ہوئے اور سلطان وقت کو علم کے بوریہ نشین پر قربان ہوتے ہوئے دیکھا، دنیا کی علمی تاریخ میں یہ واقعہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ جب ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی بیمار ہوئے اور ان کی صحت سے ناامیدی ہوئی تو سلطان ابراہیم شرقی نے پانی کا پیالہ ان کے سر پر گھما کر خدا سے عرض کیا کہ ملک العلماء سے میری سلطنت کی رونق اور آب وتاب ہے، اور ان کی ذات خلق خدا کے لیے سرچشمۂ فیض ہے، تو ان کی جگہ مجھے قبول فرما، اور ان کو اٹھا کر میری سلطنت کو بے چراغ

اور کم قیمت نہ کر، یہ دعا قبول ہوئی، ملک العلماء نے ابراہیم شرقی کی وفات (۸۴۴ھ) کے پانچ سال بعد (۸۴۹ھ) تک دنیا کو اپنے علم و درس اور تصنیف و تالیف سے فیض پہنچایا۔

جونپور میں علم اور علماء

سلاطین شرقیہ کے ہشتاد (۸۰) سالہ دور حکومت (۸۰۲-۸۸۱ھ) میں دہلی اور جون پور کے درمیان سیاسی زور آزمائی بھی جاری رہی، اور علمی تقابل و مسابقت بھی، پہلی کوشش کے نتیجہ میں جون پور نے کوئی پائیدار کامیابی حاصل نہیں کی، لیکن دوسرے مقابلہ میں جون پور بارہا دہلی سے بازی لے گیا، اور علمائے دہلی نے علمائے جون پور کی عظمت اور علمی تفوق کو تسلیم کیا، سلطنت شرقیہ کے زوال کے بعد بھی علمائے جون پور کا دور دورہ اور ان کا علمی دبدبہ قائم رہا، دسویں صدی میں مولانا الہ داد جون پوری (م ۹۲۳ھ) اور مولانا بہاء الدین (م ۹۱۱ھ) جیسے علمائے کاملین، اور گیارھویں صدی میں دیوان محمد رشید (م ۱۰۸۳ھ) جیسا فاضل یگانہ و مرشد زمانہ، ملا محمود جون پوری (م ۱۰۶۲ھ) جیسا مجتہد فن اور یکتائے روزگار عالم نظر آتا ہے، جس کی "شمس بازغہ" درس نظامی کے نظام شمسی میں بلند ترین مقام رکھتی ہے، بارھویں صدی میں جس طرح دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ذات میں بیک وقت مدرسہ و خانقاہ اور ہاتھ میں جام شریعت و سندان عشق نظر آتے ہیں، اسی طرح اس صدی کی ابتدا میں جون پور میں دیوان محمد رشید کے خلف رشید بلکہ ارشد دیوان محمد ارشد (۱۱۱۳ھ) صاحب درس و صاحب ارشاد ہیں۔

تیرھویں صدی میں جون پور کو اس صدی کے مجدد حضرت سید احمد شہیدؒ کے دو جلیل القدر خلفاء حضرت مولانا سخاوت علیؒ اور حضرت مولانا کرامت علیؒ کے وجود پر ناز ہے، اول الذکر نے جون پور اور باندہ میں برسوں درس و تدریس میں مشغول رہ کر صدہا جلیل القدر عالم اور مدرس پیدا کیے، اور اضلاع مشرقیہ میں عقائد و اعمال کی اصلاح کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، آخر الذکر سے بنگال کے وسیع اور پسماندہ خطہ نے دین کی روشنی اور علم کی چاشنی پائی، اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور آخر میں کسی ایک شخص نے اتنے وسیع خطہ اور اتنی کثیر تعداد کو اپنی تبلیغی مساعی سے متاثر نہیں کیا، پھر جب مدارس کا دور آیا، تو شیخ امام بخش کے

مدرسۂ حنفیہ نے نصف صدی تک علم کی شمع روشن رکھی، اور ہندوستان کے متعدد جلیل القدر علماء ومدرسین نے اس کو اپنے درس تدریس سے رونق بخشی، اس لیے جون پور اس وقت سے جب فیروز شاہ کے عہد میں وہ آباد ہوا تھا، اس وقت تک علم کی امانت اپنے سینے سے لگائے رہا، اس گذشتہ تاریخ اور ان شاندار روایات کی بنا پر اس کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ یہ اہم تعلیمی اجتماع اس کی سرزمین پر منعقد ہو۔

حضرات! زمانہ کے انقلابات نے دہلی اور جون پور کی سیاسی رقابت صدیوں پہلے ختم کردی تھی، اور جون پور نے دسویں صدی ہی میں دہلی کی سیادت ومرکزیت تسلیم کرلی تھی، علم کی ترقی واشاعت میں اس وقت سے وہ دہلی کے دوش بدوش اور قدم بقدم ہے، موجودہ تعلیمی اجتماع جس میں مشرقی اضلاع کے اہل علم واہل فکر جمع ہیں، اور جونپور کو میزبانی کو شرف حاصل ہو رہا ہے، اس بات کا تازہ ثبوت ہے کہ وہ اس اہم تعلیمی مسئلہ میں دہلی کے ساتھ اشتراک عمل اور تعاون کے لیے تیار ہے اور اس کو دہلی کی اولیت ومرکزیت تسلیم ہے۔

قدیم اور جدید طرز حکومت کا موازنہ

حضرات! پہلے حکومت ایک محدود ادارہ تھا، جس کا تعلق زیادہ تر ملک کے نظم ونسق، فوج پولس اور محاصل ومالیات سے ہوتا تھا، زندگی کے بہت سے شعبے اس کے دائرۂ عمل اور دائرۂ اثر سے خارج ہوتے تھے، قوم اپنے نظام تعلیم، تہذیب وتمدن، اخلاق ومعاشرت میں آزاد ہوتی تھی، اور اس بارے میں خود مختار تھی کہ وہ ان کا جو سانچہ پسند کرے اختیار کرے یا گذشتہ سانچہ قائم رکھے، اس کا نتیجہ تھا کہ انقلاب سلطنت سے ضروری نہ تھا کہ تعلیم وتہذیب میں کوئی انقلاب آئے، تاتاریوں کے حملہ کی قیامت خیزی ابھی تک دنیا کو یاد ہے، اس نے تمام عالم اسلام کی چولیں ہلا دیں، لیکن عالم اسلام کے نظام تعلیم وتہذیب کو نہیں چھیڑا، ہندوستان کے فاتحین اور حکمراں خاندانوں نے یہاں کے نظام تعلیم اور اس کے مختلف عناصر اور قوموں کی تہذیبی وتعلیمی خود مختاری میں بہت کم دخل دیا، یہ طرز حکومت کچھ خوبیاں بھی رکھتا تھا اور کچھ معائب بھی، اس وقت اس کی خوبیوں اور نقائص کا موازنہ مقصود نہیں، لیکن جب سے یورپ

میں نئی طرز کی جمہوری حکومت کا آغاز ہوا، یہ سمجھا جانے لگا کہ حکومت محض ایک انتظامی مشین نہیں، بلکہ اس کی حیثیت ایک اتالیق اور مربی منتظم کی ہے، اس کا دائرۂ عمل ملک وقوم کی پوری زندگی پر وسیع، اور اس کے حدود واختیارات زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں، وہ قوم کو تعلیم دینے، تہذیب سکھانے اور اس کی دماغی تربیت کی بھی ذمہ دار ہے، اس طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ حکومتیں پورے پورے ملک اور پوری پوری قوم کی تعلیم کا بندوبست کرتی ہیں، اس کے لیے وسائل تعلیم مہیا کرتی ہیں، لاکھوں کی تعداد میں مدارس ومکاتب قائم کرتی ہیں، اور تعلیم کو عام کرنے کی لیے جبری تعلیم کے قانون کا نفاذ کرتی ہیں۔

حکومت درحقیقت ایک اتالیق اور سرپرست کی حیثیت رکھتی ہے

حکومت کا یہ جدید رجحان - جس کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ نہیں ہے- ایک بڑا ترقی پسندانہ مبارک رجحان ہے، واقعہ یہ ہے کہ حکومت کو انتظامی، فوجی ومالیاتی دائرے میں محدود کردینا حکومت کا کا ایک جماداتی تخیل اور فرائض حکومت کا نہایت تنگ اور محدود تصور ہے، ایک صحیح اور فرض شناس حکومت درحقیقت ایک اتالیق (Guardian) اور ایک خیر خواہ و شفیق سرپرست (Patron) ہی کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے ان تمام فرائض وخدمات کی انجام دہی کی توقع بجا ہے جو ایک شفیق سرپرست اور ایک مستعد فرض شناس مربی انجام دیتا ہے۔ حکومت کی ایک اہم ترین ذمہ داری ہے کہ اپنے شہریوں کی تعلیم کا انتظام کرے اور ان کو خواندہ وتعلیم یافتہ بنانے کی امکانی جدوجہد کرے، تعلیم کے وسائل ومراکز مہیا کرے اور کوشش کرے کہ ملک میں ایک بھی ناخواندہ اور اور بے شعور انسان نہ رہے، جہاں تک حکومت کے اس بنیادی تخیل کا تعلق ہے، کسی صاحب شعور انسان کو اس سے اختلاف نہیں ہوسکتا۔ صحیح دینی حکومت جس کا نمونہ خلافت راشدہ تھی، اسی بنیادی عقیدہ پر قائم ہوئی کہ حکومت پوری قوم کی اتالیق ہوتی ہے، فرق اتنا ہے کہ خلافت نے اپنے کام کو حرف شناسی اور خواندگی میں محدود نہیں سمجھا تھا اور اس نے کبھی قناعت نہیں کی کہ ساری قوم خواندہ ہوجائے بلکہ قوم کے اخلاقی شعور اور اخلاقی بلوغ کو اپنا منتہائے نظر بنایا، اس طرز حکومت کے ایک معتبر

نمائندے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے مشہور تاریخی فقرے میں اس طرزِ حکومت کی اسی امتیازی خصوصیت کو بیان کیا، جب خالص انتظامی ذہنیت رکھنے والے بعض کارکنانِ حکومت نے ان کی اصلاحی تجاویز اور جمہور کے دینی رجحان کی وجہ سے حکومت کے مالی خسارے کی شکایات کیں تو انھوں نے اپنے طرزِ حکومت کی طرف سے یہ کہہ کر مدافعت کی اور اس کو حق بجانب ثابت کیا: "جن کے ہم قائم مقام ہیں [یعنی محمد رسول اللہ (ﷺ)] وہ تحصیلدار بنا کر دنیا میں نہیں آئے تھے، مصلح اور ہادی بن کر دنیا میں آئے تھے۔"

زیرِ قدمت ہزار جان است

حکومت کا یہ بنیادی تخیل کہ قوم کی عمومی تعلیم اس کا فرضِ منصبی ہے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، نہایت قابلِ قدر اور لائقِ تحسین اقدام ہے، اس میں کسی شخص کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن یہ اقدام جتنا مبارک اور عظیم الشان ہے اس کا راستہ اتنا ہی نازک اور مشکل ہے، اور اس پر چلنے کے لیے بڑی سبک روی اور احتیاط کی ضرورت ہے کہ:

ع　　زیرِ قدمت ہزار جان است

جبری تعلیم: اندیشے اور نقصانات

ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف عقائد، مختلف اخلاقی قدروں اور مختلف مذاہب کی قومیں آباد ہوں، تعلیم کا جبری اور عمومی نظام نافذ کرنے کے لیے بڑی وسعتِ نظر، وسعتِ قلب اور شدید احتیاط کی ضرورت ہے، ذرا سی بے احتیاطی کم نظری، یا عجلت کی کارفرمائی سے اس کا اندیشہ ہے کہ جن قوموں کو اپنے عقائد جان سے زیادہ عزیز ہیں، ان کی زندگی میں ایک ایسی تلخی اور کوفت اور ایک ایسی ذہنی کشمکش پیدا ہو جائے جو اس ملک کی اخلاقی زندگی کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں، وہ یا تو ایسے نظامِ تعلیم کا مقاطعہ اپنا دینی فرض سمجھیں یا نہایت بددلی اور ذہنی کشمکش کے ساتھ اس کو قبول کریں، ایک نظامِ تعلیم کی یہ بہت بڑی ناکامی اور اس کے مرتب کرنے والوں کی بڑی غیر دانشمندی ہے کہ آبادی کی ایک بڑی تعداد اس کا گرمجوشی اور

مسرت کے ساتھ استقبال نہ کرے۔

دانشمندانہ طرز عمل

ایسے مختلف المذاہب اور مختلف العقائد ملک کے لیے سب سے زیادہ دانش مندانہ طرز عمل یہ ہے کہ اس ملک میں عمومی و جبری نظام تعلیم کو پوری شدت اور خلوص و دیانتداری کے ساتھ غیر جانبدارانہ اور نامذہبی رکھا جائے، اور اس کو آبادی کے کسی عنصر اور کسی فرقہ کے (خواہ وہ تعداد میں کتنا ہی غالب کیوں نہ ہو) عقائد و مذہبی روایات کا نمائندہ اور وکیل نہ بنایا جائے، ایسا ممکن ہے، اور اس وقت بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں ایسا ہو رہا ہے، خود یورپ و امریکہ میں جہاں مذہبی احساس ہندوستان کی طرح تیز بھی نہیں ہے، اس کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے، انگریزوں کا دور حکومت ہمارے لیے کسی طرح لائق تقلید اور قابل رشک نہیں، لیکن اس بارے میں اس کی مثال دی جاسکتی ہے کہ اس دور میں نصاب کی کتابیں بالکل غیر جانبدارانہ اور نامذہبی ہوتی تھیں، اور ان میں کسی فرقہ یا قوم کی مخصوص چھاپ اور اس کے مذہب کی جھلک نہیں ہوتی تھی، یہی طرز عمل ہندوستان کے لیے ہر زمانہ میں مناسب ہے۔

تعلیم میں اخلاقی عنصر

البتہ اگر اخلاقی عنصر کو تعلیم کا جزو بنانے کا خیال ہے اور اس سے ذہنی اور اخلاقی تربیت حاصل کرنے کے مقصد سے یہ ضروری سمجھا جائے کہ بعض روحانی شخصیتوں، معلمین اخلاق، اور پیشوایان مذہب کا ذکر ہو تو پھر اس کا لحاظ ضروری ہے کہ پوری فراخ دلی کے ساتھ ان ناموروں اور اخلاقی و روحانی شخصیتوں کا تعارف ہو جن کی اخلاقی بلندی، پاکیزہ نفسی، روحانیت، خدمت خلق، سچی خدا پرستی اور انسانیت دوستی ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے، خواہ وہ اپنے عقائد و اعمال کے لحاظ سے کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، ان دو راستوں (ایک کامل غیر جانبداری و نامذہبیت، اور ایک مکمل رواداری و بے تعصبی) کے علاوہ اس ملک کے لیے کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔

حیرت اور مایوسی

حضرات! اس معیار سے جو ہر طرح عادلانہ اور عاقلانہ ہے، اور جس کی پشت پر اصول تعلیم اور انسانی نفسیات کے دلائل کا ایک دفتر اور تاریخی واقعات اور حقائق کا ایک لشکر ہے، جب ہم اپنی نامذہبی (Secular) ریاست کے نامذہبی نظام تعلیم و نصاب تعلیم کو جانچتے ہیں تو ہم کو بڑی مایوسی اور حیرت ہوتی ہے، ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ ان دو راستوں میں سے جو ہندوستان کی نوخیز جمہوری حکومت کے لیے ہر طرح موزوں و مناسب تھے، کوئی راستہ اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ ایک تیسرا راستہ اختیار کیا گیا ہے، جو اس ملک کے لیے بھی موزوں نہیں ہے جس نے کبھی بھی نامذہبی ہونے کا اعلان نہ کیا ہو، چہ جائیکہ وہ ملک جو اپنے دستور میں بار بار نامذہبی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

دیومالائی اثرات

ہم ایک طرف نصاب تعلیم کی وہ کتابیں دیکھتے ہیں جن میں صاف صاف اور نمایاں طور پر ایک ہی فرقہ اور ایک ہی عنصر کی مذہبی روایات، تاریخی شخصیات اور قدیم علم الاصنام (دیومالا Mythology) کے اسباق ہیں، ان **اسباق میں** ان عقائد و تخیلات کو پیش کیا گیا ہے جو کم سے کم مسلمانوں کے بنیادی عقائد (توحید و رسالت) سے صرف یہی نہیں کہ مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ ان کی تردید کرتے ہیں، مسلمان بچہ جو ان سرکاری مدارس میں تعلیم پانے پر مجبور اور دوسرے ذرائع تعلیم سے عام حالات میں محروم ہے، تعلیم اور نوشت و خواند کے نام سے ایسے عقائد و تخیلات قبول کرتا ہے جو ان بنیادوں سے متصادم ہیں، جن پر اس کے مذہب کی عمارت قائم ہے، اور جن کا اعتقاداً قبول کر لینا اس کے لیے ذہنی و اعتقادی ارتداد کے مرادف ہے، اگر اس کا ذہن سلیم ان کے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے یا اس کے گھر کا ماحول اور تعلیم اس کی تردید کرتی ہے (جس کی موجودہ حالات کے لحاظ سے بہت کم توقع ہے) تو اپنے نصاب کی بے وقعتی اور غیر معقولیت کا قائل ہوتا ہے، اور خود ایک کشمکش اور

ذہنی الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے، یہ دونوں نتیجے کسی نظام تعلیم کے لیے اچھے اور قابل قبول نہیں، نہ یہ کہ بچہ جو مدرسے میں اپنے والدین کی امانت ہے، اپنے والدین کے عقائد اور اپنے مذہب کے بنیادی حقائق سے باغی ہو جائے، نہ یہ کہ وہ تعلیم بھی حاصل کرتا رہے اور اس کی فطرت سلیم اس کے قبول کرنے سے انکار بھی کرتی رہے، اور اس کو وہ بعید از قیاس اور ناقابل فہم بھی معلوم ہوتے رہیں۔

حکومت کی زیر نگرانی تیار کردہ نصاب میں جانبدارانہ طرز عمل

دوسری طرف آپ اردو کی وہ سرکاری کتابیں دیکھیے جو مختلف تعلیمی منزلوں کے لیے تجویز کی گئی ہیں، اور حکومت کے زیر نگرانی تصنیف ہوئی ہیں، ان میں کس طرح صرف ایک فرقے اور ایک مکتب خیال کی نمائندگی کی گئی ہے، اور صرف اس کی روایات، تقریبات اور مذہبی و تاریخی و سیاسی شخصیات (Heroes) کا انتخاب کیا گیا ہے، اور کس طرح دوسرے فرقوں اور جماعتوں (Communities) کی نامور شخصیتوں، قابل ذکر تقریبوں اور زندگی کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کیا گیا ہے، میں آپ کے سامنے صرف ایک نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یوپی کے محکمۂ تعلیم نے اردو کی جو بیسک ریڈریں تیار کرائی ہیں، ان میں بزرگوں اور شخصیتوں کے سلسلہ میں صرف شری رام چندر جی، شری کرشن جی، سورداس، تلسی داس، میرا بائی کے متعلق اسباق ہیں، تیرتھوں اور مذہبی مقدسات میں صرف اجودھیا، متھرا، کاشی، پریاگ، گنگا، رامائن کا تذکرہ ہے، تاریخی واقعات میں سے بھرت ملاپ، دھنش یگ پر ہلاد کا انتخاب کیا گیا ہے، رہنماؤں اور لیڈروں میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، ایشور چند ودیا ساگر، مدن موہن مالوی تلک، لالہ لاجپت رائے، سردار پٹیل، راجندر پرشاد، سروجنی نائڈو، پنڈت پنت، ٹنڈن جی کا نام ملتا ہے، پورے سلسلہ میں کہیں کسی مسلمان شخصیت، کسی اسلامی تقریب، کسی تاریخی روایت حتی کہ جنگ آزادی کے بھی کسی مسلمان قائد اور رہنما کا تذکرہ نہیں ہے، اگرچہ اس سلسلہ میں منگل پانڈے، تانتیا ٹوپی اور بھگت سنگھ تک کو فراموش نہیں کیا گیا ہے۔

ایک کھلی ناانصافی

میں یہ عرض کروں گا کہ یہ صرف مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے؛ بلکہ ہندوستان کے ساتھ بھی بڑی ناانصافی ہے کہ اس کو خواجہ معین الدین اجمیریؒ جیسے کامل انسان، مخدوم شرف الدین یحییٰ بہاریؒ جیسے خداشناس، نظام الدین اولیاءؒ جیسے سچے خداپرست، ناصرالدین محمود جیسے درویش صفت بادشاہ، شیرشاہ سوری جیسے اعلیٰ مدبر و منتظم، امیر خسرو جیسے شاعر خوش نوا وفخر ہندوستان، عبدالرحیم خان خاناں جیسے جامع کمالات انسان، شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسے حکیم و فلسفی، ٹیپو سلطان جیسے غیور و بلند ہمت انسانوں کی پیدائش، اور پرورش کے شرف سے محروم کردیا جائے، جن کی وجہ سے ہندوستان کا پایہ سارے مشرق اور پورے ایشیا میں بلند ہے، اور بڑے بڑے اہل کمال کا سرعقیدت اس کے آگے خم ہے، یہ نئی نسلوں کے ساتھ بھی ناانصافی ہے کہ ان کو انسانیت کی ان تابناک مثالوں اور ہندوستان کے ان سرمایۂ فخر فرزندوں کے نام اور کام سے واقف ہونے کا کوئی موقع نہ دیا جائے، جن کی زندگی صرف اسی ملک کے لیے نہیں، دنیا کے تمام نوجوانوں کے لیے قابل تقلید، اور ان کا کردار انسانی سیرت کی تعمیر اور شخصیت کی تکمیل کے لیے ایک بیش بہا طاقت ہے۔

ایک اہم مسئلہ

حضرات! نصاب کی یہ نوعیت، نظام تعلیم کا یہ جارحانہ رجحان اور اس کے مرتبین کی یہ کوتاہ نظری مسلمانوں کی قومی زندگی کا سب سے اہم اور دشوار مسئلہ بن گیا ہے، دوسرے معاشی وسیاسی مسائل اس مسئلہ کے مقابلہ میں ہیچ ہیں، مسلمانوں کو جب تک اس کی طرف سے اطمینان نہ ہو کہ ان کی آئندہ نسلیں اسلام پر قائم رہیں گی، اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کسی قومیت اور نسل کا نام نہیں، وہ عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے، اس وقت تک مسلمان ایک شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا رہیں گے، اور ان کو اپنے مستقبل کی طرف سے وہ اطمینان وسکون حاصل نہیں ہوگا جو اس قوم کے لیے ضروری ہے، جو اپنے ماضی کے اعتبار سے بھی اور اپنی موجودہ صلاحیت اور تعداد کے اعتبار سے بھی اسی ملک کی تعمیر و ترقی کا ایک اہم

عنصر ہے، مجھے معلوم ہے اور آپ حضرات بھی بے خبر نہ ہوں گے کہ حساس مسلمانوں کا ایک طبقہ شدید کشمکش میں مبتلا ہے، اسی کشمکش کا نتیجہ وہ تاریخی کنونشن ہے جو تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے گذشتہ جنوری میں بمبئی میں منعقد ہوا، اور جس میں سارے ملک سے مسلمانوں کی مختلف الخیال جماعتوں اور اداروں نے شرکت کی، بہت سے مسلمان اس مسئلہ کے حل سے مایوس ہوکر یا مستقبل کی خطرناکی کو دیکھ کر اس ملک کو چھوڑ دینے پر غور کرنے لگے ہیں، اور میرے اور آپ کے لیے یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے کہ بہت سے خاندانوں نے محض اسی وجہ سے اس ملک کو خیرباد کہہ دیا، میں اس شکست خوردہ ذہنیت کا سخت مخالف ہوں، اور اس کو مسئلہ کا حل بالکل نہیں سمجھتا، اس کو اس عظیم تعداد کے ساتھ بے وفائی بھی سمجھتا ہوں جس کو اس ملک میں رہنا ہے، لیکن اس سے بہرحال مسلمانوں کی شدت احساس اور تلخی احساس کا اظہار ہوتا ہے، اور ہمیں سنجیدگی کے ساتھ اس واقعہ پر غور کرنا چاہیے۔

خلافِ عقل وعدل تعلیمی صورت حال اور اس کا مقابلہ

اس صورت حال کا مقابلہ - جو خلاف عقل بھی ہے اور خلاف عدل بھی، جو مسلمانوں کے ملی وجود کے لیے بھی خطرہ ہے اور ہندوستان کی سیاسی قوت وعظمت کے لیے بھی - دو طرح سے ممکن ہے، ایک یہ کہ پوری قوت وجرأت کے ساتھ اس کا مطالبہ کیا جائے کہ ہماری نامذہبی ریاست کا نظام تعلیم پوری دیانت داری کے ساتھ نامذہبی ہو، اس نصاب تعلیم سے وہ تمام اجزاء خارج کیے جائیں جو مذہبی اور کسی خاص فرقہ کی تعلیمات وعقائد وتاریخ کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ بنیاد ہر طرح معقول ومستحکم ہے، آپ جو اس ملک میں قیام کا فیصلہ کر چکے ہیں، جو یہاں پیدا ہوئے اور یہاں کے شہری ہیں، جو حکومت کے محاصل ومطالبات ادا کرتے ہیں، جن کو حق رائے دہندگی حاصل ہے، جو حکومتوں اور وزارتوں کی تشکیل میں دخیل ہیں، جن کو کوئی حکومت اور کوئی سیاسی پارٹی نظر انداز نہیں کر سکتی، جن کی رائے اور تعداد کا پاسنگ ہر پلڑے کو جھکا سکتا ہے، ان کو تمام خصوصیتوں سے قطع نظر محض ہندوستانی اور شہری ہونے کی بنا پر بھی اس کا حق ہے کہ وہ اس کا مطالبہ کریں کہ اس ملک کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم ان کے بنیادی عقائد اور ان کے مذہبی جذبات وضروریات کے مطابق ہو یا کم سے کم

ان کو مجروح کرنے والا اور ان کو چیلنج کرنے والا نہ ہو، اس مطالبہ میں ہندوستان کے تمام معقولیت پسند عناصر آپ کی تائید کریں گے، اور یہ صورت حال جس میں زیادہ دن باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے اور جو بالکل غیر طبعی اور خلاف فطرت ہے، جلد تبدیل ہو جائے گی، لیکن اس کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ مسئلہ آپ کی زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے، اور آپ کے لیے مذہبی و روحانی طور پر موت و زندگی کا سوال ہے، اور آپ کے لیے اس کے مقابلہ میں کوئی اور متوازی راستہ نہیں ہے۔

صباحی ومسائی مکاتب کا قیام

دوسرا حل یہ ہے کہ آپ اپنے ان بچوں کی دینی و اخلاقی تعلیم کا خود بھی بندوبست کریں، جو جبری تعلیم کے قانون کے مطابق سرکاری مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں، اس کا سہل اور قابل عمل راستہ یہ ہے کہ آپ اس مقام پر جہاں مسلمانوں کی کچھ تعداد آباد ہے، صباحی و مسائی مکاتب و مدارس کا انتظام کریں، جہاں آپ کے بچے سرکاری اسکول جانے سے پہلے ایک آدھ گھنٹہ یا سرکاری اسکول سے آنے کے بعد ایک آدھ گھنٹہ دینی تعلیم حاصل کریں۔

دو طاقتیں

اس سلسلۂ تعلیم کے قیام اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے: ایک عزم کی، دوسرے نظم کی، ان دو طاقتوں سے ہزاروں کی تعداد میں ایسے مکاتب و مدارس قائم ہو سکتے ہیں، وسائل و ذرائع ہر دور میں اور ہر ملک میں انسانی فیصلہ اور عزم کے تابع رہے ہیں، عزم نے ان کو حاصل کیا اور نظم نے ان کو کارآمد اور دوررس بنایا، اب بھی جہاں کہیں یہ دو چیزیں پیدا ہو گئیں ہیں انھوں نے وسائل کو بھی مسخر کر لیا ہے، اور موانع کو بھی مغلوب بنا لیا ہے، میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ کم سے کم دو مقامات (ضلع بستی اور شہر سیتاپور) میں عزم اور نظم نے اس مشکل کو آسان کر کے دکھا دیا ہے، اور بتا دیا ہے کہ ہر مقام پر انھیں دو طاقتوں سے اس مہم کو سر کیا جا سکتا ہے، اور مدارس و مکاتب کا ایک ایسا غیر سرکاری جال بچھایا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ ہزاروں بچے اپنے عقائد و فرائض اور دینیات اور اردو کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک اہم مطالبہ

حضرات! آپ نے اپنے ایک گمنام کارکن اور سپاہی کو (جس کا دائرۂ عمل جلسوں اور کانفرنسوں سے دور دور رہا ہے) ایک اہم تعلیمی کانفرنس کی صدارت کی عزت بخشی، سپاہی حقیقت پسند اور عملی ہوتا ہے، میں آپ سے آخر میں اسی کا مطالبہ کرتا ہوں کہ آپ اپنے آہنی عزم اور عاقلانہ نظم سے اپنے تعلیمی اور دینی مستقبل کو اس ملک میں محفوظ بنائیں، جہاں آپ نے رہنے کا فیصلہ کیا ہے، اور جس کو آپ کے پیغمبرانہ پیغام کی ضرورت ہے، آپ اپنی متحدہ آواز اور پُر امن لیکن طاقتور احتجاج سے نظام تعلیم کے اس نقص کو دور کریں جو اس ملک کے بنیادی دستور اور سیاسی منشور کے بھی خلاف ہے اور اس ملک کی قدرتی ساخت اور واقعات کے بھی خلاف ہے، آپ مطالبہ کریں کہ وہ نظام تعلیم یا تو خلوص اور دیانت داری کے ساتھ نا مذہبی ہو، یا انصاف و رواداری کے ساتھ مذہبی، ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ نہیں، دوسرے اپنے عزم ونظم سے صباحی ومسائی مکاتب و مدارس کا جال بچھا دیجیے، اور ہر سرکاری مکتب اور مدرسہ کے ساتھ ایک دینی مدرسہ اور مکتب قائم کیجیے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ صرف اس ایک اجتماع میں مختلف گاؤں، قصبات اور شہروں سے آئے ہوئے وہ مخلص اور صاحب اثر مسلمان اور اہل علم ہیں کہ اگر وہ تنہا اس کا عزم کر لیں کہ وہ واپس جا کر ایسے مدارس اور مکاتب قائم کریں گے، تو سیکڑوں کی تعداد میں ایسے مدرسے قائم ہو سکتے ہیں، اور جہاں تک اضلاع مشرقی کا تعلق ہے یہ مسئلہ بہت حد تک حل ہو سکتا ہے، میں ان سب بزرگوں اور دوستوں سے عرض کروں گا ؎

غافل منشیں نہ وقت بازیست
وقت ہنر است وکار سازیست

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ وَ صَحْبِهِ أَجْمَعِيْنَ۔ (۱)

(۱) جون پور میں منعقد دینی تعلیمی کانفرنس کا خطبۂ صدارت، ماخوذ از ماہنامہ ''الفرقان''، لکھنؤ (شمارہ شعبان ورمضان ۱۳۷۷ھ)۔